زلفی

یعنی

جنگل کی دوسری کہانی

بندروں کی فوج اور شکاری اژدہا

مصنفہ

محمد عنایت اللہ خاں بی۔اے

سنہ ۱۹۲۶ء

دارالاشاعت پنجاب

بار دوم ۲۰۰۰ قیمت ۸

دیباچہ طبع اوّل

خلاف توقع اکثر دوستوں نے جنگل کی پہلی کہانی کو پڑھا اور بہت پسند کیا۔ چند بزرگوں نے بھی جن کی زبان دانی کی عظمت مترجم تو کیا چیز ہے۔ بڑے بڑے کے دل سے نہیں مٹ سکتی قصّہ کو پڑھ کر طرز بیان اور عبارت کی بے اختیار تعریف کی۔ بعض دوستوں کے ذہن اور پیارے بچّے زلفی کی باتوں پر ایسے فریفتہ ہوئے۔ کہ آگے کی کہانیاں سُننے کا شوق ظاہر کرنے لگے۔ لڑکیوں نے بھی اُس کو پڑھا ہنسیں اور خوش ہوئیں اور اِس کی شکایت کی۔ کہ کہانی اُدھوری کیوں چھوڑ دی۔ غرض کچھ تو بعض بزرگوں اور دوستوں کی فرمایش سے۔ اور کچھ اِس شرما شرمی میں کہ مُنہ مانگی نہ سہی واجبی داد مل چکی ہے۔ اور سب سے زیادہ ترجمہ کرنے کے خبط نے مجبور کیا۔ کہ جہاں ایک کہانی لکھی ہے۔ وہاں دوسری بھی سہی ؛

پہلی کہانی کا سا لطف تو شاید اِس کہانی میں نہ آئے کیونکہ ترجمہ کی وقتوں نے اس تحریر کے رنگ کو پہلی تحریر سے کسی قدر مختلف کر دیا ہے۔ اکثر جگہ بندروں کا ذکر ہے۔ اور یہ مضمون وہ ہے جس کے لئے مُصنّف ہی کی زبان کچھ بہت وضع ہوئی ہے۔ مترجم کی زبان میں وہ تلوّن وہ تغیّر وہ بے قراری اور اضطراب کہاں؟ محض صوت الفاظ اور فقرہ کی چُست بندش سے کانوں میں شور اور آنکھوں میں جست و خیز کی تصویر پھر جانی بلکہ خود دھینگا مُشتی پر طبیعت کا آمادہ ہو جانا کچھ انگریزی ہی زبان کا حق

ہے۔ اُردو غریب میں اتنی جان نہیں۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ اپنا تعلّق خدا کی
اس مخلوق سے برائے نام رہ گیا ہو۔ حیوان ناطق و مطلق میں تمیز تو انسان ہر وقت کر سکتا
ہے لیکن ایک حالت ایسی بھی ہوتی ہے۔ کہ تمیز کرنے کو جی نہیں اُٹھتا۔ آگے چل کر شاید
اس سے بھی بڑھ کر کوئی درجہ آتا ہو۔ بہرکیف بندروں کا ذکر پڑھ کر ناظرین کے دل پر
اگر کچھ اثر ہو تو اُنہیں مسٹر کپلنگ کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ مترجم سے کوئی شکایت نہ
پیدا ہونی چاہیئے۔ اور جانوروں کا حال بھی مصنّف نے کچھ ایسا دل میں دل
ڈال کر لکھا ہے کہ اگر اِن جانوروں میں بھی مصنّف ہوا کرتے۔ تو وہ بھی اس سے بہتر
اپنا حال نہ لکھ سکتے۔

پہلی کہانی میں محاورات وغیرہ کی کچھ غلطیاں انگریزی خواں ہونے کی بدولت رہ گئی تھیں۔
چنانچہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے جو مترجم کے حال پر غایت درجہ بزرگانہ لطف و کرم رکھتے ہیں
پہلی کہانی کو دیکھ کر فرمایا تھا۔ کہ اگر دوسری کہانی کا ترجمہ کرو۔ تو مسودہ ہمارے پاس بھیج دینا۔ مترجم نے
اس حکم کی تعمیل کی۔ اور اب اُس کو فخر ہے کہ اس کہانی کے مسودہ کو ایسے زباں داں نے درست
کر دیا ہے۔ جس کی اُردو نظم و نثر سے اِس وقت ملک کے لاکھوں نونہال اپنی مادری زبان
سیکھ رہے ہیں۔ مولوی صاحب قبلہ کی اس تکلیف کا مترجم ہمیشہ شکر گذار رہیگا۔

مولوی صاحب کے فرزند اکبر محمد محمود صاحب کا شکریہ لکھنا بھی مترجم کا پہلا فرض ہے۔
کہ اُنہوں نے باوجود طرح طرح کی پریشانی اور کثرت کار کے مسودہ کے چھپوانے کا کل
اہتمام۔ اپنے ذمّہ لیا۔ اور ہم مکتب ہونے کا پورا حق ادا کیا۔

ع ۔ ا ۔ جون پور ۱۲۔ جون ۱۹۰۲ء

بھالوجی کا پاٹ شالہ

یہ تو آپ جنگل کی پہلی کہانی میں پڑھ چکے ہونگے۔ کہ بھیڑیوں کی بے وفائی سے بیزار ہوکر زلفی جنگل سے رخصت ہوا مگر جو حال ہم اس کہانی میں لکھتے ہیں۔ وہ اس سے کئی برس پہلے کا ہے + یہ وہ زمانہ ہے۔ کہ زلفی پورا چھ برس کا ہوکر ساتویں میں لگا ہے۔ اور بھالوجی کے سامنے بیٹھا سبق سنا رہا ہے ؛

بیٹھے بٹھائے شامت جو آئی تو بھورے بندروں سے یارانہ جا گانٹھا + ایک دن بے خبر پڑا سوتا تھا۔ کہ بہت سے بندر آئے۔ اور موقع پاکر اس کو اٹھالے گئے + آگے پڑھوگے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ بھالوجی اور بگھیرے نے اس کے پیچھے کہاں کہاں کی خاک چھانی۔ کیسی کیسی مصیبتیں اُٹھائیں۔ اور کس کس جتن سے اس کو بندروں کی قید سے

چھڑا کر لائے ۔

ہاں تو بھالو جی جنگل کے پرانے استاد اور ان کے پڑھانے کا ڈھنگ بھی سب سے نرالا ۔ کسی مندر یا شوالے میں تو آپ کا گذر کہاں ہوتا ۔ بن کے بیچوں بیچ ایک پرانے پیپل کی جڑ میں جا بیٹھتے ۔ اور سامنے ہری ہری دوب پر بھیڑیوں کے لونڈوں کا پاٹ شالہ جما لیتے تھے + پاٹ شالہ کاہے کو ہوتا تھا ۔ بس صحرائی لڑکوں کا دنگل سمجھئے ۔ خیر دنگل ہو یا پاٹ شالہ ۔ اب تو جنگل میں بھی ایک جگہ رہ گئی تھی ۔ جہاں سے درندوں کی اولاد لائق فائق ہو کر نکلتی تھی ۔

سبق تو خدا جانے یہ لڑکے کیونکر یاد کرتے تھے ۔ مگر کشتیاں لڑ کر غل مچانے کا تو یہ حال تھا ۔ کہ پیڑوں پر سے شہد کی مکھیاں تک چھتے چھوڑ چھوڑ کر بھاگ جاتی تھیں ۔ اور جب تک بھالو جی ایک آدھ لونڈے کو ٹھونک پیٹ کر تختہ نہ بنا ڈالتے کوئی لڑکا دم سمیٹ کر ادب سے نہ بیٹھتا تھا ۔

بی قہرن نے میاں سے مشورہ کر کے لڑکے کو ریچھ کے حوالہ کر دیا تھا ۔ ریچھ کو بھی زلفی کی طرف خاص توجہ تھی ۔ اس کی وجہ یہ تھی ۔ کہ بھیڑیوں کے لڑکے ایسے بد شوق اور کھلنڈرے ہوتے تھے ۔ کہ استاد کا دل ان سے اچاٹ رہنے لگا تھا ۔ ان لڑکوں کو

جہاں جنگل کی بھاکا میں دو چار انچھر وہ بھی اپنی ٹولی کے یاد ہو گئے۔ پھر وہ کبھی مکتب کا رخ نہ کرتے۔ پہاڑوں اور گھاٹیوں میں شکار کھیلتے پھرا کرتے ؛

اُن کا بڑا سبق یہ تھا۔ کہ بھیڑیوں کو پہچاننے لگیں۔ پھر یہ سبق کچھ ایسا مشکل بھی نہ تھا فقط یہ مضمون تھا ؎

چلتے ہیں دبے پاؤں۔ نہیں چال میں آہٹ۔
آنکھیں گھُپ اندھیرے میں بھی ہوتی نہیں چوپٹ +
پہچانتے ہیں بھٹ میں پڑے رُخ کو ہوا کے
کیا خوب ہے۔ کیا خوب ہے کانوں کی بناوٹ +
ہیں کچلیاں اور دانت چمکدار نوکیلے۔
اس قوم کے گن ہیں یہی پہچان لے جھٹ پٹ +
ہے گیدڑوں کا چودھری البتہ طباقی۔
کتّوں پہ لپکتا ہے لکڑ بھگا بھی سرپٹ +

اس کے آگے پھر یہ لڑکے ایک حرف نہ یاد کرتے تھے۔ بھالو کو اس کا بڑا قلق رہتا تھا۔ مگر اب تو زلفی کی ذہانت دیکھ کر سب کچھ بھول گیا تھا ؛

زلفی اوّل تو آدمی کا بچّہ۔ پھر اُستاد کی خاص توجہ۔ جو سبق اُس کو ملتا ایسا لمبا چوڑا ہوتا۔ کہ یاد کرتے کرتے بالکل ہار جاتا۔ پھر بھی

یاد کئے بغیر نہ چھوڑتا۔

کبھی کبھی گمبھیرا بھی شکار کھیلتا اِدھر آنکلتا تھا اور یہ دیکھ کر کہ زلفی بیٹھا اُستاد کو سبق سُنا رہا ہے۔ خوش ہوتا۔ اور کسی درخت سے چند یا کھجانے لگتا۔

جنگل کی بہت سی باتیں زلفی نے سیکھ لی تھیں۔ پیڑ پر چڑھنے کی مشق تیرنے سے زیادہ۔ اور تیرنے کی مہارت دوڑنے سے بڑھ کر ہوگئی تھی۔ اور بھاگنے کا تو یہ حال تھا۔ کہ ہرن بھی صورت دیکھ کر چوکڑیاں بھول جاتے تھے۔ مگر یہ سب باتیں تو زلفی کو جنگل کی پہلی کتاب ختم کرتے ہی آگئی تھیں مشکل چیزوں کا وقت تو اب آیا تھا۔

کچھ دنوں سے بھالو نے جنگل کی پوتھی میں سے روکھ ودّیا اور جل ودّیا کے منتر شروع کرا دیئے تھے۔ اور تھوڑے ہی دن میں شاگرد کو ایسا اُستاد بنا دیا۔ کہ پیڑ پر چڑھتے ہی ابھی ڈال پر پاؤں نہیں رکھا ہے۔ اور بول اٹھا۔ کہ شاخ مضبوط ہے یا کمزور۔ اونچی ڈال کو تاڑتے ہی مکھیوں کو دم جھانسے دیکر کسی پھلواری کا پتہ بتا دینا۔ اور ان کے جاتے ہی چھتوں میں سے شہد نچوڑ چٹ کر جانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جلتی دوپہر اور چلچلاتی دھوپ میں پیڑوں پر چڑھ پتّوں کے جھُرمٹ میں بیٹھ کر سو جانا اور سونے کو جی نہ چاہا تو غریب چمگادڑ کو جگا کر ستانا روز کا مشغلہ تھا۔

کہو۔ بی دیدوں پھوٹی۔ آج تمہارا جی کیسا ہے ؟ خیر سے اُلٹی کیوں لٹکی ہو؟ کوئی چٹ پٹی کہانی سناؤ۔ تو ہم بھی تمہارے ہی پاس اُلٹے لٹک رہیں "۔

چمگادڑ غریب جھنجلا کر کہتی "ڈر موئے میری آنکھیں دکھتی ہیں "۔ اور پھڑ پھڑ کرتی ڈال سے دو گز نیچے کہیں لٹک رہتی۔ اور زلفی اس زور سے ہنستا کہ ایک بیری کی چڑیاں جھڑ جھڑ کرکے دوسری بیری پر ایک سپاٹے میں پہنچ جاتیں اور کچھ دیر غُل مچا کر چُپ ہو جاتیں۔

پانی میں اترنے سے پہلے پانی کے سانپوں اور کیچڑ کی جونکوں کو خبردار کرتا۔ کہ ہم آتے ہیں۔ اور مینڈکوں کو ڈانٹ بتاتا۔ کہ بڑوں کو دیکھ کر ٹرٹر فوراً بند کرنی چاہیئے۔

جب تک اِن باتوں کو کوئی بتائے نہیں بھلا آپ سے آپ کس کو آسکتی ہیں اور اُن کے بے سیکھے جنگل میں کون ایک گھڑی جی سکتا ہے ؟ اور پھر بن باسیوں کی نازک مزاجی کا حال کچھ جنگل والوں ہی سے پوچھئے۔ کہ جہاں کسی پردیسی جانور نے اچانچک اُن کی بستی میں قدم رکھا۔ اور یہ سمجھے کہ بس اب زندگی بے حلاوت ہوئی۔ سب ہی تو مل کر مسافر غریب پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ یوں تو سبق سب ہی مشکل تھے۔ مگر اپنے دیس سے نکل کر پردیس میں بھوک کے وقت شکار کی صدا لگانی زلفی کو بہت دنوں میں یاد ہوئی۔

اوّل تو اپنا علاقہ چھوڑ کر دوسرے کی زمین میں جانا اور پھر غیروں سے شکار کی اجازت مانگنی۔ اور جب تک جواب نہ ملے۔ بھوکے بھیڑیوں کی لَے میں صدا لگانی "بھوکے ہیں۔ یارو کرلیں شکار۔ عف عف عف"، سخت مشکل کام تھا۔ اگر کسی نے سُن لیا۔ تو میاں پردیسی کو شکار کی اجازت مل جاتی تھی۔ لیکن وہ کوئی بڑا سا شکار تاکتے تھے۔ تو فوراً پہاڑ کی چوٹی یا چٹان کی گگر سے جنگل کا کوئی چودھری للکار اُٹھتا۔ کہ خبردار بھوک سے زیادہ ڈیل ڈول کا شکار اِس بن میں مارا تو تم جانوگے! بھیڑیوں کے اخلاق پر تو بھلا کس کی مجال ہے کہ منہ آئے۔ لیکن یہ آواز پہاڑوں اور جنگلوں میں ایسی گونجتی پھرتی تھی۔ کہ جھاڑی کی اوٹ سے کوئی نہ کوئی شکار گھبرا کر نکل ہی پڑتا تھا۔ اور میاں پردیسی کھا پی کر اپنا رستہ لیتے تھے۔

بس اِس پر قیاس کر لیجیے۔ کہ زلفی کو کتنی باتیں برزبان یاد کرنی پڑتی ہونگی۔ اور ایک ہی بات کو سو سو دفعہ رٹنے میں کیسی جان پر بنتی ہوگی۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ بھالو جی بھی جو بات کہتے تھے۔ بہت دُور کی کہتے تھے۔

ایک دن بگھیرے کے سامنے زلفی سبق میں کچھ بھولا۔ اور اُستاد کا چپت کھاتے ہی جھنجلا کر درخت پر جا چڑھا۔ تو بھالو بگھیرے سے بولے "بزرگوں نے سچ کہا ہے۔ کہ آدمی کا بچہ پھر آدمی کا بچہ دو ٹانگ

کا پلّا ہے + غصّہ تو دیکھو ہر وقت ناک پر دھرا رہتا ہے۔ بیٹا چاہے خوش ہو کر پڑھو۔ چاہے خفا ہو کر۔ جنگل کی پوتھی جب تک پوری نہ یاد کر لو گے۔ جنگل میں کوئی دن جینا مشکل ہے + کیوں بھیّا بگھیرے سچ کہتا ہوں یا جھوٹ؟ بھیڑئے کا پوت ہوتا۔ تو خیر بُری بھلی طرح گذر کر بھی لیتا۔ آدمی کا بچّہ بھلا تم ہی بتاؤ جنگل میں کیا کر سکتا ہے؟ اِس کو بَن کی پوتھی یاد کرانی تو لوہے کے چنے چبانے ہیں ؛

بگھیرا۔ چنے چبانے ہوں یا بادام پھوڑنے۔ آپ کے نزدیک تو سب شہد کے گھونٹ ہیں + لیکن ذرا غور تو فرمائیے۔ اس مختصر سے سر میں یہ آپ کے مسائل صید و شکار اور یہ آپ کی ٹھائیں ٹھائیں کیونکر سما سکتی ہے؟ بے چارے کا سر تو دیکھئے کیسا چھوٹا ہے ؛

بھالو۔ چھوٹے سر کو بڑا بنانا تو میرا کام نہیں ہے۔ جنگل میں کوئی چیز ایسی چھوٹی بتائیے۔ جس کو گھر بیٹھے شکار کر کے گذارا کرنا آسان ہو؟ یہ تو جنگل ہے۔ اور جنگل بھی خونخواروں کا۔ جے پور کا عجائب گھر تو نہیں۔ کہ گھنٹی بجتے ہی چھلا چھلا یا رانب کاٹنے کی تول مِل گیا۔ اور کھا پی خس کی ٹٹی میں مُنہ ڈال سو رہے + میں تو خود اِس کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ جب بالکل ہی جی نہیں لگاتا۔ تو آہستہ سے ایک آدھ چٹخنا لگا دیتا ہوں۔ وہ بھی بہت

ہلکے ہاتھ سے "

بگھیرا۔ اللہ رے آپ کے ہلکے ہاتھ۔ پھولوں کی چھڑیاں بھی بھاری ہوتی ہیں۔ اب کیوں بھرے مکتب میں لونڈوں کے سامنے فضیحت کراتے ہو۔ گروجی خرّانٹ! یہ آپ کے ہاتھ ہیں یا لکڑی کی کھڑاؤں میں لوہے کی میخیں جڑی ہیں؟ ان ہی ہلکے ہاتھوں نے تو غریب کا سارا مُنہ لہولُہان کر دیا۔ اور آپ کے نزدیک گویا کوئی بات ہی نہیں۔ واہ!

بھالو بگڑ کر بولے " مُنہ لہولُہان کرنا کیسا۔ اگر ہم سر سے پاؤں تک خون کی بوٹی بنا دیں۔ تو بھی کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا + آج کا لہولُہان ہونا اچھا یا کل کو جاہل کندۂ ناتراش رہ کر جنگل کی خاک پھانکنی اچھی؟ کہنے کو تو کہہ گئے۔ یہ نہ دیکھا۔ کہ کس طرح اِس کے پیچھے اپنا خون پانی ایک کر رہا ہوں۔ جنگل کا ایک ایک منتر اِس کو یاد کرایا ہے + اگر بھول نہ گیا۔ تو مجال ہے۔ کہ بھیڑیوں کو چھوڑ کر جنگل کا کوئی شکاری زمین کا چلنے والا ہو یا ہوا کا اُڑنے والا۔ اِس کو بُری آنکھ سے دیکھ سکے۔ جانوروں کے جس غول میں جائیگا۔ فوراً اس کو پناہ دی جائے گی۔ پھر اگر اُسی کی بھلائی کے لئے ایک آدھ طمانچہ لگا دیا تو کون سے لعل جھڑ گئے؟"

بگھیرا۔ یہ تیز گفتگو سُن کر جی میں شرمندہ سا ہو گیا۔ اور ہنسی میں

ٹال کر بولا" گرو جی قصور معاف ہو۔ تم گرو۔ اور یہ لونڈے تمہارے چیلے۔ جس طرح چاہے سدھاؤ پڑھاؤ۔ پر ذرا اِس کا خیال رہے۔ کہ یہ غریب بچّہ پیپل کی جڑ یا برگد کا تھنا نہیں ہے۔ جس پر کبھی آپ بھولے سے پنجے تیز کرنے لگیں۔ مر ہی کر تو رہ جائیگا۔ بے قدروں کی کون قدر کرے۔ ہم تو سدا کے جاہل اکھڑ ہیں۔ الف کے نام دھول اور بے کے نام دھپّے کے سوا کچھ نہ آیا۔ مگر کان میں بات پڑی رہنی اچھّی ہے۔ ذرا وہ مہامنتر ہم کو بھی تو سنوائیے۔ جو آپ نے اِس چیلے کو سونپے ہیں؟ یہ تو ظاہر ہے۔ کہ ہم کو اُن کا کیا کام پڑ سکتا ہے۔ جو اپا ہجوں کے دست گیر ہوں وہ خود محتاج ہو کر دوسروں کے سامنے کیا ہاتھ پھیلائیں گے" اور اتنا کہ گجھیرے نے ایک ہاتھ آگے بڑھایا اور سمٹے ہوئے پنجے کو پھیلا کر انگلیاں چھدری کرلیں اور اُنگلیوں کے سروں پر اُودے اُودے فولاد کے سے ڈھلے ہوئے ناخنوں کو جو لوہار کے کُنٹیاں یا سنگ تراش کی چھینیاں معلوم ہوتے تھے۔ غور سے دیکھ کر بولا" اِن سے بڑھ کر جنگل کا کون سا منتر ہوگا۔ لیکن ذرا اس بچّہ کے منہ سے وہ منتر ضرور سنوائیے"

بھالو نے تکلّف کے ساتھ گردن پھیر کر بہت اطمینان سے آواز دی " زلفی زلفی۔ بیٹا۔ بس غصّہ کو تھوک دو۔ اور ذرا اِدھر چلے آؤ"

درخت پر سے کسی نے مُنہ چڑایا اور آواز کی نقل اُتاری" بلفی بلفی - ہاؤں ہاؤں - سر میں تو میرے اب تک سنسنے کاٹ رہے ہیں - اور انہوں نے پھر زلفی زلفی جپنا شروع کر دیا - اب کیا مجھے جان سے مارو گے ؟ اور اِس آواز کے آتے ہی ڈال پر سے کوئی چیز پھسلی اور دھم سے زلفی زمین پر کودا اور جدھر ریچھ بیٹھا تھا اُدھر سے کترا کر بگھیرے کے پاس چلا آیا اور کہنے لگا " میں تو اپنے بگھیرے کے پاس آیا ہوں - کوئی تمہارے پاس نہیں آیا - بھالو جی موٹے ! بھالو جی موٹے !!"

ریچھ اپنے جی میں کُڑھ کر بولا " اِن کے پاس آئے یا میرے پاس - بات ایک ہی ہے - اچھا جب جانیں کہ آج کا سبق فر فر سُنا جاؤ ؟"

زلفی " اچھا تو کس جانور کا منتر سُنئے گا - جنگل کے تو بیسیوں منتر ہیں - وہ پوچھئے جو نہ آتا ہو ؟"

بھالو " واہ وا شاباش - دو چار ہی باتیں سیکھ کر ایسے پھولے سنتا ہے یار بگھیرے - اِس زمانہ میں اُستاد کی کیا قدر ہوتی ہے - اور ایسے محسن کا احسان کیونکر مانا جاتا ہے - اسی جنگل میں لونڈے پڑھاتے پڑھاتے عمر گذر گئی - مگر آج تک کسی بھیڑیئے کے لڑکے کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ مکتب چھوڑے پیچھے پھر کبھی اُستاد کے سلام کو

آتا۔ اچھّا دانشمند۔ ذرا درندے شکاریوں کا منتر تو سناؤ۔ بڑے لایق بنے ہو"

زلفی کو سبق تو یاد ہی تھا۔ بہت خوش ہو کر اُستاد کے لہجے میں زور زور سے دہاڑنے لگا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ؎

جو خوں خوار ہو تم۔ تو خوں خوار ہیں ہم +
کسی بات میں تم سے ہرگز نہیں کم +
ہمارا تمہارا ہے خون ایک یارو +
نہ ہم تم کو ماریں۔ نہ تم ہم کو مارو +

بھالو دل میں بہت خوش ہوئے باچھیں کھل گئیں۔ یہ نہیں معلوم اپنی لیاقت پر یا شاگرد کی تیزی پر۔ اور بولے "اچھا اب پنچھی پکھیرو کا بھی منتر سنا ڈالو"

زلفی نے دو چار تیز بولیاں بول کر اخیر میں بڑے زور سے زقیل دی۔ اور سیٹیاں بجا کر چُپ ہو گیا +

بھالو "اچھا اب سانپ کا منتر اور سنا دو۔ پھر چھٹی"

زلفی نے اس سوال کے جواب میں کلّے اور نتھنے پھُلا کر ایسا پھُنکارا مارا۔ کہ بگھیرا چار ہاتھ اُچھل کر دور جا کھڑا ہوا۔ اور بے اختیار مُنہ نیچا کر کے گھاس میں اِدھر اُدھر سونگھنے لگا +

اور اب چھٹی ملتے ہی زلفی زمین پر ہاتھ ٹیک۔ ہوا میں دولتیاں

جھاڑ۔ تالیاں بجاتا ہوُا کود کر بگھیرے کی پیٹھ پر جا سوار ہوُا۔ اور دونوں پاؤں ایک طرف کو ڈال کر جلدی جلدی لگا ایڑیاں چلانے۔ اور بگھیرے کی پسلیوں پر ڈھول بجانے۔ اور بھالو کے ایسے ایسے مُنہ چِڑائے کہ جو جنگل والا اُدھر سے نکلا۔ مارے ہنسی کے گھاس پر لوٹنے لگا یا دُم دبا کر بھاگ گیا ٭

بھالو غصّے کی صورت بنا کر پیار سے بولے "دیکھو دیکھو۔ یہی باتیں تو مار کھانے کی ہیں۔ ارے! بے وقوف۔ مینڈک۔ جب سمجھ آئیگی تو یاد کرے گا کہ ہاں بھالو بھی کوئی تیرا بڑا بوڑھا تھا" ٭

یہ کہہ کر ریچھ بگھیرے سے باتیں کرنے لگا۔ اِدھر اُدھر کی گپ شپ اور جنگل کی خیر خبر کے بعد بولا "یہ منتر جو آپ نے ابھی ابھی اِس لڑکے کی زبان سے سُنے نہایت مشکل سے دستیاب ہوئے ہیں۔ گجپال ہاتھی کی توجہ سے جو اکثر مست رہتے ہیں۔ اور تن پر بھبوت ملے کھیتوں میں گنّے کھایا کرتے ہیں۔ یہ علم مجھ تک پہنچا۔ بلکہ اُنہوں نے تو یہاں تک تکلیف گوارا کی کہ ایک دن ژلفی کو کندھے پر چڑھا کر سرپ جھیل تک لے گئے۔ اور وہاں اپنے پُرانے دوست جل ناگ سے اُس کو سانپ کا منتر یاد کرا لائے ٭ میرا حال تو آپ جانتے ہی ہیں کہ نہ گلا پایا ہے نہ گلپھڑے۔ پھُنکاروں تو کیونکر پھُنکاروں؟ اور جب کوئی چیز خود نہ آتی ہو۔ تو دوسرے کو کیا سکھائی جائے۔ غرض

آپ کی توجہ سے اب یہ قہرن کا لاڈلا اتنا ہو گیا ہے۔ کہ جنگل کا کوئی اصیل جانور خواہ درندہ ہو یا پرندہ۔ چرنے والا ہو یا رینگنے والا۔ اس کو گزند نہیں پہنچا سکتا۔ اور اب یہ لڑکا صحرا کے سب کھٹکوں سے بے جوکھ ہے"؛

بگھیرا۔ یوں فرمائیے کہ بھیڑیوں کی برادری کے سوا جنگل کے اور خطروں سے محفوظ ہے۔ کیوں بھیا زلفی۔ تم بھی کچھ سمجھتے ہو؟ ارے ارے۔ پسلیاں کیوں توڑے ڈالتا ہے بیٹھا ہے تو نچلا بیٹھ۔ ناچنے کیوں لگا۔

جنگل کی اچھوت جاتی

بڑوں میں باتیں ہو رہی تھیں۔ زلفی کو بھی بیچ میں بولنا ضرور تھا۔ کبھی بگھیرے کی گردن میں ہاتھ ڈال کر شانہ کی کھال کھینچتا۔ کبھی زور زور سے لاتیں مار کر چیختا۔ یہاں تک کہ بات کرنی دسوار کر دی۔ ناچار بھالو نے کہا "اچھا کہو کیا کہتے ہو؟"

زلفی چہک کر بولا "گروجی۔ آپ کو کچھ خبر بھی ہے۔ ہم کہاں گئے تھے۔ ابھی ابھی جب درخت پر چڑھے تھے۔ ہم نے نواب پیڑ والوں سے یارانہ گانٹھا ہے۔ ایک بڑی ساری فوج تیار کی ہے جنگل میں خوب ڈاکے ڈالینگے۔ وہ ہماری فوج ہوگی۔ اور ہم اُس کے سردار۔

بگھیرے نے گھرک کر کہا "ارے بے وقوف۔ یہ کیا بکتا ہے۔

ں؟"

ں" ہاں ہاں جب لڑنے بھڑنے سے چھٹی ملیگی۔ تو پیڑوں
ر گروجی کی چندیا پر خوب کوڑا کرکٹ پھینکا کریں گے۔
اُن سے خوب پکا قرار ہو گیا ہے۔ گروجی سمجھے؟"
و نے بھوں بھوں کر کے اُلٹے ہاتھ کا کفچہ زلفی کے جڑا
رتے ہی لُڑکنیاں کھاتا بگھیرے کے اگلے دونوں پاؤوں
ں لیٹے لیٹے کن انکھیوں سے دیکھنے لگا۔ کہ بھالو جی تو
فا ہو گئے۔

و کو حقیقت میں غصہ آ گیا تھا۔ کہنے لگا "زلفی۔ میں تیرا
مجھا۔ نابکار تو نے بندروں سے دوستی کی ہے۔ اور اُن ہی
ں تو گیا تھا۔ ہم تو یوں رات دن تیری سیوا کریں۔ اور تو
سیکھے۔ اب بتا تیری کیا سزا ہے؟"

ں نے بھالو کی طرف سے نظر اُٹھا کر بگھیرے کی صورت دیکھی
ں بھالو کی طرح یہ بھی تو خفا نہیں ہو گئے۔ لیکن بگھیرے کی
ں سے کچھ پتہ نہ چلا۔

الو غصے میں تو بھرے بیٹھے ہی تھے زلفی کو پھر ڈانٹنا شروع
یرا شاگرد ہو کر اور بندروں میں بیٹھے۔ اور بندر بھی بھورے
ال منہ والے۔ جن کا کوئی والی ہے نہ وارث۔ جن میں کھانے

احتیاط ہے نہ پینے کی شرم !!"
زلفی۔ اچھا تو پھر آپ نے مجھے مارا کیوں تھا؟ میں بھی روٹھ کر نکل گیا۔ تھوڑی دور گیا تھا۔ کہ پیڑوں پر سے بہت سے بندر دھم دھم کر کے کُود پڑے۔ اور میرے پاس آتے ہی سب مجھ پر ترس کھانے لگے۔ آپ کو مجھ پر ترس آتا۔ تو بندر میرے پاس کیوں آتے؟" اتنا کہتے ہی زلفی اُلٹی ہتیلی سے ناک رگڑنے لگا۔ خدا معلوم اُستاد کی خفگی کا اثر تھا یا کوئی مکھی ناک میں لات مار کر اُڑ گئی تھی۔

بھالو " ارے احمق! بندر اور کسی پر ترس کھائیں؟ جیٹھ بیساکھ کا سورج ٹھنڈا پڑ جائے سچ۔ پہاڑ سے رو اُترے اور شور نہ ہو سچ۔ پر بندروں کو کسی پر ترس آئے جھوٹ۔ اور سو کا ایک جھوٹ۔ آگے تو بتا کیا ہوا؟"
زلفی " پھر مجھے بھوکا دیکھ کر وہ جلدی جلدی گئے اور بہت سارے کچے پکے پھل کلّوں میں بھر کر میرے پاس لائے۔ اور ڈنڈا ڈولی کر کے مجھے درختوں پر چڑھا لے گئے۔ اور ڈال ڈال پات پات کی سیر کرائی۔ اور میری صورت خوب غور سے دیکھ کر بولے " اوہو تم تو ہمارے بڑے پُرانے یار ہو۔ یار کیسے بلکہ بھائی ہو۔ اتنے دن سے کہاں تھے؟ اچھا۔ اور یہ کیا! دُم کہاں چھوڑ آئے؟ دیکھو یار۔ یہ دُم کی کسر اچھی نہیں۔ خیر۔ اب آگئے ہو تو ہم تم کو اپنا سردار

بنائیں گے"۔

بھالو "ارے مورکھ! بندروں کا کوئی سردار نہیں۔ اس ریوڑ کا ہانکنے والا آج تک جنگل میں پیدا ہؤا نہ ہو۔ وہ کیا جانیں۔ سردار کس چڑیا کا نام ہے؟ سدا کے جھوٹے لپاٹیے ہیں"۔

زلفی "جھوٹے ہوں یا سچے۔ میری تو اُنھوں نے بہت خاطر کی۔ اور پھر بُلوا دیا ہے +گردن تو آپ کو ہر بات پر ہلا دینی آتی ہے جیسے میں بندروں میں گیا ہی نہ تھا۔ صورت شکل پوچھ لیجئے۔ بھالو۔ وہ یہ کہتے تھے۔ جب سے ہماری چُٹیا اُڑی ہے۔ چندیا میں فقط دو کان رہ گئے ہیں۔ اہا ہاہا! اور دیکھنا بھالو جی۔ تم ذرا سنو تو۔ چھوٹے چھوٹے گول گول دیدے خوب پٹ پٹ جھپکاتے ہیں۔ اور صورت بڑی پیاری پیاری مٹکنا سی ہوتی ہے۔ اور اِدھر تو دیکھو۔ کبھی کبھی میری طرح پاؤں پاؤں چلنے لگتے ہیں۔ تو بڑی ہنسی آتی ہے۔ اور ایسے بڑے بڑے لکڑی سے ہاتھوں سے نہیں مارتے جیسے آپ کے ہاتھ ہیں۔ سارے دن نئے نئے کھیل نکال کر کھیلتے ہیں۔ اچھے میرے بھالو۔ اِس پیڑ پر چڑھ جاؤں دیکھو۔ وہ پتّوں کی اوٹ۔ اُدھر نہیں۔ وہاں تو کوّا بیٹھا ہے۔ اِدھر دیکھو وہ جہاں ہری ہری ٹہنیاں ٹوٹی ہیں۔ دو تین پاس پاس بیٹھے دیدے مٹکا رہے ہیں۔ اچھے میرے بھالو۔ اس پیڑ پر چڑھ

جاؤں؟ ابھی کھیل کر چلا آؤنگا"۔

بھالو بہت جھلّا کر بولے "آدمی کے بچّے سُن لے" اور بھالو کی آواز ایسی ڈراؤنی تھی جیسے گرمی کی رات میں پچھلے پہرے آندھی کا بادل گرجتا ہو۔ سُن لے ہیں نے تجھ کو جنگل کی پوتھی سے بَن کی بدّیا سکھائی اور تمام بَن باسیوں کے بڑے بڑے منتر یاد کرائے۔ کہ کسی موذی جانور سے تجھ کو اذیت نہ پہنچے + بندروں کا کوئی منتر نہیں ہے۔ اِن کے خفقان کی دوا لقمان کو بھی یاد نہ تھی۔ وہ پیڑوں کے رہنے والے ہیں۔ اُن کے ہاں کسی قانون کا رواج نہیں۔ جانت برادری سے باہر ہیں۔ کوئی اُن کی بولی نہیں ہے۔ جو بات جس کے منہ سے سُنی۔ اُسی کی نقل اُتارنے لگے۔ چور ہیں۔ اُچکے ہیں۔ اُٹھائی گیرے ہیں۔ درختوں میں چھُپے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور پتوں کی اوٹ سے جنگل والوں کو تاکتے جھانکتے ہیں + اُن کا طریق ہمارا طریق نہیں۔ اُن کا کوئی ہادی و رہنما نہیں۔ کوئی بات ان کو کبھی یاد نہیں رہتی۔ رات دن ڈینگیں مارتے اور گپّیں ہانکتے ہیں۔ خوب شیخیاں بگھار بگھار کر خیالی پُلاؤ پکاتے ہیں۔ جنگل میں اپنی قوم سے بڑھ کر کسی کو نہیں مانتے۔ اور سمجھتے ہیں۔ کہ جب کوئی جنگل میں بڑا کام ہوگا۔ وہ اُن ہی کے پُرفن دماغ کا نتیجہ ہوگا + لیکن حقیقت حال یہ ہے۔ کہ اگر پیڑ پر سے ایک سڑا گولر بھی ٹپک

پڑتا ہے۔ تو سب کے سب کلکاریاں مار کر ہنسنے لگتے ہیں۔ اور
برسوں کے منصوبے ایک آن میں بھول جاتے ہیں + ہم جنگل
کے بھلے جانوروں کو اُن سے کچھ سروکار نہیں۔ جس گھاٹ وہ
پانی پیئیں۔ اُس گھاٹ ہم پانی نہیں پیتے + جس رستہ اُن کے قافلے
جائیں۔ اُس رستے ہم قدم نہیں دھرتے + جہاں وہ مرتے ہیں۔ وہاں
ہم کو مرنا بھی ناگوار ہوتا ہے + آج سے پہلے کبھی اس ناپاک قوم کا
نام تو نے میری زبان سے سُنا تھا۔ تو ہی بتا؟"
زلفی۔ بگھیرے کے پیروں ہی میں پڑے پڑے چپکے سے بولا
"جی نہیں۔ کبھی نہیں۔" اور زلفی کی آواز سب نے سُن لی۔ کیونکہ
بھالو کے خاموش ہوتے ہی جنگل میں ایسا سناٹا ہو گیا تھا۔ کہ تنکا
بھی گرتا تو سب سُن لیتے +
بھالو نے پھر اُسی طرح کڑک کر کہنا شروع کیا۔ "اور ہم وہ ہیں۔
بندر کا خیال دل میں اور بندر کا ذکر زبان پر نہیں لاتے + وہ بد ہیں
بے شرم ہیں۔ ناپاک ہیں اور بے شمار ہیں۔ اور اگر ان کی کوئی دلی تمنا
ہے۔ تو بس یہ ہے۔ کہ جنگل والے اُن کو دیکھیں۔ اور سمجھنے لگیں
کہ یہ بھی کچھ ہیں۔ لیکن ہمارا طریق یہ ہے اور یہ ہی طریق سب سے
بہتر ہے۔ کہ ہم اُن کی مطلق پروا نہیں کرتے + اتنا بھی نہیں جانتے
کہ وہ کدھر بستے ہیں۔ پیڑوں پر سے کوڑا کرکٹ پھینکنا تو کوئی بڑی

بات نہیں۔ اگر وہ رات بھر ہمارے سروں پر نجاست بھی پھینکتے رہیں۔ تو بھی ہمارے بھاویں نہیں "۔

بھالو ابھی پوری بات کہنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ املی پر سے کتاروں کی بوچھار آئی۔ اور ایک دفعہ ہی آس پاس کے درختوں سے کھانسنے کھنکارنے اور گلا صاف کرنے کا وہ غل مچا کہ سب پریشان ہوگئے۔ اور ابھی یہ طوفان بے تمیزی کم نہ ہؤا تھا۔ کہ پیڑوں میں بندروں کا بھونچال آیا۔ تو ڈال ڈال نومیں پات پات۔ ایک ایک بندر نے چقندر کی طرح مُنہ لال کرکے اِس غضب کی دھمّال شروع کی۔ کہ درختوں کی ڈالیں زمین پر جُھک جُھک کر چوٹیوں کو سلام کرنے لگیں۔ بھالو بیٹھے سے اُٹھ کھڑا ہؤا اور بگھیرا بھی گھبرا کر دُم ہلانے لگا۔

بھالو نے زلفی کو جھنجوڑ کر کہا " بس دیکھ لے اور سُن لے اور سمجھ لے اور کبھی نہ بھولنا۔ کہ جنگل کے شریف شکاریوں پر بندر حرام کیئے گئے ہیں۔ اگر اب کبھی پھر ایسی حرکت تو پنجوں سے کھال کھینچ کر دھوپ میں سوکھنے ڈال دوں گا "۔

بگھیرا " ہاں۔ بھیا۔ پھر ایسی حرکت نہ کرنا۔ بات تو جب تھی کہ اُستاد پہلے ہی سے شاگرد کو ہوشیار کر دیتے اور یہ نوبت ہی نہ آتی "۔

بھالو "مجھے خبر تھی۔ کہ یہ آپ کے لاڈلے درختوں کو نشیمن بنا کر بندروں کی صحبت اختیار کریں گے۔ اور بندر بھی بھورے بندر + توبہ توبہ کس کا نام لیا "۔

بھالو چپ نہ ہوئے تھے کہ درختوں پر سے کوڑے کرکٹ سوکھے پتوں اور ٹوٹی ٹہنیوں کا ایک چھنراؤ اور آیا + اب تو بھالو جھرجھری لے پوستیں جھاڑ کھڑے ہو گئے اور بگھیرے کو اشارہ کر زلفی کو ساتھ لے درختوں کے نیچے سے نکل میدان کے رستے پڑ لئے ۔

بندروں کا چودھری

ریچھ نے بندروں کے احوال میں جو کچھ گفتگو کی تھی۔ وہ بے جا نہ تھی۔ بندر درختوں کے رہنے والے ہیں۔ اور درندوں کی عادت ہے۔ کہ منہ اُٹھا کر بہت کم اوپر دیکھتے ہیں + اس لئے نہ یہ اُن کا رستہ کاٹتے تھے۔ نہ وہ اِن کا + لیکن بندروں میں خودنمائی کا شوق اس درجہ بڑھا ہوا تھا۔ کہ راہ چلتے شکاریوں کو چھیڑتے + اگر بیمار بھیڑیا۔ تھکا ہارا ریچھ۔ یا زخمی نیندوا۔ زمین پر پڑا مل جاتا۔ تو بچھ وہاں سے نہ ٹلتے۔ جھپٹ جھپٹ کر آتے اور مٹھیاں چوم چوم بیمار کو لانگ دوسری طرف کو دجاتے۔ اور پھر زخمیوں کے سرہانے

ناچ رنگ کی محفلیں جما دیتے۔ اور ایسے بے سُرے گیت گا گا کر اور
دھر پتیں الاپ الاپ کر غُل مچاتے۔ کہ کوئی نہ مرتا ہو۔ تو مر جائے ؛
پیڑوں پر چڑھ کر رہ گیروں پر آواز کستے کہ اوپر آؤ تو بتائیں۔
اِس پر کوئی مُنہ نہ لگاتا تو کسی آم کی گُٹھلی اور امرود کے چھلکے ہی
پر لڑائیاں ٹھن جاتیں۔ اور ٹولیاں بنا کر کُشت و خون میں مصروف
ہو جاتے۔ اور اپنے مُردوں کو بے گور و کفن درختوں کے نیچے پڑا
چھوڑ جاتے۔ کہ جنگل والوں کی نظر پڑے۔ اور وہ اُن کے ناپاک
مُردوں کو سونگھ سونگھ کر زبان سے ناک چاٹتے ہوئے بھاگ
جائیں ؛

مگر باوجود اِن زیادتیوں کے کوئی کان تک نہ ہلاتا تھا۔ اور
پنچائتیں ہوا کرتی تھیں۔ کہ کسی بڑے بوڑھے بندر کو چودھری
بنایا جائے۔ قانون و آئین جاری ہوں۔ نظم و نسق کا سلسلہ قایم
ہو۔ جس پر سارا جنگل عش عش کرے ؛

لیکن کبھی یہ منصوبے پورے نہ ہوتے تھے۔ آج کی بات کل کو
یاد رکھتے تو سب کچھ ہوتا اگر کسی کو کچھ خیال بھی رہا۔ تو بزرگوں
کی یہ مثل یاد کر کے کہ "جو آج بچاریں بندر وہ کل بچاریں بھالو"
دل کو تسلی دے لیتے تھے ؛

غرض ہر بات میں تقدیم و ایجاد کا شرف بندروں ہی کو حاصل

رہتا تھا۔ درندوں کی پہنچ سے باہر تھے۔ اور باہر کیوں نہ ہوتے۔
جس صورت میں بندر کا ذکر کرنا تو کیسا بندر کا خیال تک ذہن میں لانا
باعث شرم سمجھا گیا ہو۔ تو پھر صحرا کا وہ کون سا شکاری تھا جو اُن
کی مزاج پرسی کی ترکیب نکال کر اس رسوائی کو اپنے سر لیتا۔

اور یہ ہی وجہ تھی۔ کہ جب زلفی بندروں میں کچھ دیر کھیل کر
بھالو کے پاس گیا۔ اور بھالو اُس پر خفا ہوا۔ تو یہ بندر دل میں
بہت خوش ہوئے۔ کہ خیال کرنا کیسا۔ آج تو ہمارے قصے بڑوں کی
زبان پر ہیں۔ اور بجز اس کے کہ ادنے باتیں اور خفیف حرکتیں کر کے
دل میں خوش ہولیں ان کی زندگی کا کوئی مقصد ہی نہ تھا۔ نہ اس
کی پروا تھی کہ کیا کرتے ہیں۔ نہ اس کا فکر تھا کہ کیا ہوگا۔

چنانچہ ایک دن ایک صاحب ڈال پر بیٹھے جدھر کا ہاتھ تھا
اُدھر ہی کی بغل کھجا رہے تھے۔ کہ دفعتہً دماغ میں ایک خفیف سا
خیال پیدا ہوا۔ سمجھے کہ بات خوب نکالی۔ بلا تامل شاخ سے کود
حلقۂ احباب میں آتے ہی کہہ اُٹھے۔ کہ اگر زلفی کو قید کر لیا جائے
تو بڑا کام نکلے۔ سفر اور حضر دونوں میں آسایش ہو جائے۔

اس پر یاران طریقت بولے کہ "وہ کیا آرام سوچا ہے۔ ہم پر
بھی ظاہر ہونا چاہیئے؟" تو فرمانے لگے "یہ لڑکا ہمارے پیڑوں میں
سے ہری ہری ٹہنیاں توڑ کر لے جاتا ہے۔ اور اُن کے پتے

سونت کر کہیں اکیلا بیٹھا طرح طرح کی چیزیں بنایا کرتا ہے۔ اس کام کا سیکھنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ سیکھنے کو تو ہم سب کچھ ایک دن میں سیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس لڑکے کو پکڑنا اب ذرا ٹیڑھی کھیر ہے"۔

اِس میں شک نہیں کہ زلفی کا باپ کبھی کبھی جنگل میں لکڑیاں کاٹا کرتا تھا۔ اور اُس کی ماں ٹوکریاں بُنا کرتی تھی۔ یہ خون کا اثر تھا۔ کہ زلفی آپ سے آپ ہری ٹہنیوں کو بُن کر چھوٹی چھوٹی ٹٹّیاں بنا لیتا۔ اور جب جاڑے میں ہوا تیز چلتی۔ تو یہ غریب چھ برس کی جان کسی درخت کی آڑ میں ان ٹٹّیوں کی چھوٹی سی جھونپڑی ڈال کر لیٹ رہتا۔

کہیں ان کمبخت بندروں نے بھی اُس کو یہ کھیل کھیلتے دیکھ لیا تھا۔ اور اب اُس بندر کی بات سُنتے ہی سب کے سب دِل میں سوچنے لگے۔ کہ آندھی۔ مینہ۔ جاڑے۔ پالے اور اولوں کے طوفان سے بچنے کے لئے واقعی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں کہ زلفی کو پکڑ لے چلیں۔ اور برسات سے پہلے پہلے پیڑوں پیڑوں چھاونیاں چھوڑا دیں۔

اب تو بندروں کو پورا یقین ہوگیا۔ کہ بس آج ہماری قوم کا سردار یہ اجلاس کامل منتخب ہوگیا۔ اور کوئی دن جاتا ہے۔ کہ ہم

جنگل میں سب سے بڑھ کر لایق ہو جائیں گے۔ اور ہماری لیاقت
کا شہرہ ایسا عام ہوگا۔ کہ جنگل کے جتنے شکاری ہیں۔ سب ہی تو
چندیا کے بَل قلا بازیاں کھاتے ہوئے دُور دُور سے ہمارے دربار
میں حاضر ہوں گے۔ اور کمر سے دُمیں کھول کھول کر اپنا سر ہمارے
قدموں میں ڈال دیں گے ٭

غرض جب تھوڑی سی قیل قال اور بہت سی نوچ کھسوٹ کے
بعد یہ مسئلہ قطعی طور پر طے ہو گیا۔ کہ زلفی کو گرفتار کر لینا چاہیئے۔ تو
اُس پر عمل درآمد شروع ہوا ٭

قصد اور عمل کے درمیان تامّل کرنا تو بندروں کو آتا ہی نہ تھا۔
ہمیشہ ہتیلی پر سرسوں جما کرتی تھی۔ اِدھر زلفی بھالو اور بگھیرے
کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ کہ سینکڑوں بندر درختوں کی اوٹ
چپکے چپکے اِن کے پیچھے ہو لیا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی چیل
نے انڈا چھوڑا ہی تھا۔ کہ شکاریوں کی نیند کا وقت آیا۔ زلفی
اُستاد کی گھُرکیوں اور جھڑکیوں سے جی میں بہت شرمندہ تھا۔
اور یہ قسم کھا کر کہ اب کبھی بندروں میں کھیلنے نہ جاؤنگا۔ بھالو
اور بگھیرے کے بیچ میں لیٹ کر آنکھیں بند کرتے ہی پٹ سے
سو گیا ٭

زمین اور آسمان کے بیچ میں

اِس کے بعد جو کچھ اُس کو معلوم ہؤا یہ تھا۔ کہ کسی نے نہایت سخت
اور سوکھے ہاتھوں سے اُس کے بازو پکڑ لیئے ہیں۔ اور سارے بدن
پر کوئی جھاڑو سی چلا رہا ہے + آنکھ کھول کر دیکھا۔ تو خود درخت کی
چوٹی پر ہے۔ اور نیچے بھالو نے جاگتے ہی ایسی دُہائی مچائی ہے۔
کہ سارے جنگل کو سر پر اُٹھا لیا ہے + بگھیرا بھی کچلیاں نکال نکال
کر ایک ایک درخت پر چڑھتا ہے۔ اور پھسل پڑتا ہے۔ بندر
پیڑوں میں دھما چوکڑیاں مچا کر بھالو کی جے پکارتے ہیں "ناچ لے
جھمورے ناچ لے۔ بگھیرے۔ واہ رہے ہم واہ رہے ہماری پھُرتی"
اِس کے سوا کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی۔ ایک بندر ڈال پر
کود کر آتا ہے اور بھالو کا مُنہ چڑا چڑا کر کہتا ہے "کیوں گرو جی!
اب تو سمجھے کہ جنگل میں بندر بھی بستے ہیں" دوسرا دُور ہی سے
خم ٹھونک کر بگھیرے کو بھپکی دیتا ہے۔ کیوں۔ بھیّا صید افگن! آج
تو تم بھی ہمارا لوہا مان گئے ہوگے؟ کچلیاں کسی اور کو دکھانا۔ آج تو
سارا جنگل ہماری اُستادی کا قایل ہے۔ اب تو آپ کے خیال
شریف میں آیا۔ کہ یہ ناچیز بھی بڑی چیز ہیں۔ اِن ہی کے دادا پیر

نے لنکا پھونکی تھی"۔

اب سنئیے کہ بن کے ان لٹیروں میں بھاگڑ پڑی۔ اور پیڑوں کے رَن میں بندروں کی بھاگڑ معاذ اللہ! انسان کی طاقت نہیں کہ بیان کر سکے۔ ایک طبقہ زمین کا ہوتا ہے۔ جس پر سب چلتے پھرتے ہیں۔ اور ایک طبقہ درختوں کا ہوتا ہے۔ جس کو بندروں کی جولانگاہ پورب سے پچھّم اور اُتّر سے دکھن تک سمجھنا چاہیئے۔ جنگل میں درختوں کی چھتریاں ایک سے ایک ملی کوسوں تک چلی جاتی ہیں اور اِن میں بندروں نے بڑی بڑی سڑکیں۔ گلیاں۔ پک ڈنڈیاں ڈالیوں کے جھولے اور جھولوں کے پُل زمین سے بیس بیس تیس تیس ہاتھ اونچے بنا رکھے ہیں۔ اور اِن ہی کے رستوں رات ہو یا دن جس منزل پر چاہتے ہیں پہنچ جاتے ہیں۔ زمین پر قدم رکھنے کی ضرورت نہیں۔

زلفی کی کیفیت یہ تھی۔ کہ دو بڑے بڑے جگادری خرّانٹ بندروں نے اپنا ایک ایک ہاتھ اُس کی بغلوں میں دے رکھا تھا۔ وہ اِن کے بیچ میں جھولتا درختوں کہیں کا کہیں گھسٹتا چلا جاتا تھا۔ اور دونو بندر باوجود اِس بوجھ کے ایک ایک زقند میں دس دس بارہ بارہ ہاتھ ایک چوٹی سے دوسری چوٹی پر اُڑ جاتے تھے۔
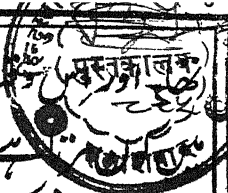
زلفی حیران تھا کہ کیا ماجرا ہے۔ اور چکر پر چکر اُس کو آتے تھے۔
مگر پھر بچہّ تھا۔ رفتار کی تیزی دل میں اُمنگ پیدا کرتی تھی + اگر
کہیں شاخوں کے ٹھنے سے زمین دکھائی دے جاتی تھی۔ تو خون
خشک ہو جاتا تھا۔ لیکن بندر تھے۔ کہ زقند پر زقند لگاتے تھے۔
خالی خولی ہوا میں جھٹکے کھاتے کھاتے زلفی کا کلیجہ مُنہ کو آنے لگا +
کبھی دونو حوالدار پیڑوں پر اتنا اونچا چڑھ جاتے۔ کہ اوپر کی پتلی
ٹہنیوں کو بوجھ کی سہار نہ رہتی۔ اور جب وہ ٹوٹنے کو ہوتیں۔ تو
کسی نیچی ڈال کو پاؤں سے پکڑ قلہ کرتے ہوئے نیچے اُتر آتے۔ اور
کبھی اونچی ڈالوں کا ایک ایک ہاتھ سے سہارا لے اُوپر اُڑ جاتے۔
مگر کسی صورت سے زلفی کو نہ چھوڑتے تھے۔ کبھی کبھی زلفی کسی
پیڑ کی پھُننگ سے ہرے ہرے سُنسان جنگل کا نظارہ اِس طرح
کرتا تھا۔ جیسے کوئی ملّاح جہاز کے مستول پر چڑھ کر کوسوں تک
سمندر کی موجوں کو دیکھتا ہو۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پتّوں میں
اُس کا مُنہ چھپ جاتا۔ اور آناً فاناً میں بندر اس بلندی سے
اُتر کر نشیب میں پہنچ جاتے۔ کہ پھر زقند لگا کر دوسرے پیڑ کی چوٹی
پر اُڑ جائیں + غرض اسی طرح پیڑوں پیڑوں بھاگتا دوڑتا جست
پر جست اور زقند پر زقند لگاتا یہ شیطانی لشکر زلفی کو خدا جانے کہاں کا کہاں
لے پہنچا +

کئی دفعہ زلفی ڈرا کہ بندر مجھے زمین پر پھینک دینگے۔ اور ایک دفعہ
تو وہ اسی خوف سے کچھ گسمسایا بھی لیکن لڑکا ہوشیار تھا۔ فوراً سنبھل
گیا۔ اور اُسی طرح چپ چاپ تن و تقدیر دونو کو بندروں کے حوالے کر
اِس مُصیبت سے رہائی کی تدبیریں سوچنے لگا۔

پہلی بات یہ سمجھ میں آئی۔ کہ کسی طرح بھالو اور بگھیرے کو اپنے حال
سے خبردار کرے۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا۔ کہ جس تیزی سے بندروں کا قافلہ
اس وقت جا رہا ہے۔ اِس حساب سے اُس کے دوست بہت پیچھے
رہ گئے ہونگے۔ اس امید میں کہ بھالو کہیں دکھائی دیگا۔ زمین کی طرف
دیکھنے کی کوشش فضول تھی۔ کیونکہ نیچے جس چیز پر نظر پڑتی تھی
وہ درختوں کی چوٹیاں تھیں۔ جو زمین کی مثل کوسوں تک پھیلی تھیں
سر پر البتہ آسمان تھا۔ جس کے چاروں گوشوں پر زلفی نظر دوڑاتا تھا
ایک طرف سورج چمک رہا تھا۔ باقی آسمان بالکل کورا پڑا تھا۔ کہ
اتنے میں دُور ایک نقطہ سا دکھلائی دیا۔ سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو آسمان
کی چیل ہے۔

جنگل کی پہرہ دار جل جوگنی

یہ جنگل کی مشہور پہرہ دارنی تھیں۔ چیل جل جوگنی اُن کا نا

[illegible]ت اِس فکر میں بلند پرواز تھیں۔ کہ دیکھوں آج جنگل [illegible] ہے۔ زلفی کی نظر پڑتے ہی چیل کو بھی شبہ ہوا۔ کہ آج بندروں نے کہیں ڈاکا مارا ہے۔ ذرا اُتر کر دیکھنا چاہیئے۔ شاید کوئی چیز کھانے کے قابل ہو۔

یہ سوچتے ہی شکست باندھی اور جھٹ کُندے جوڑ سو گز نیچے اولے کی طرح آئی۔ اور چوٹیوں سے ابھی بہت اونچی تھی۔ کہ پر پھیلا کر ہوا پر قایم ہوئی۔ اور اُسی سطح پر چکّر باندھ کر بڑی شان سے منڈلانے لگی۔

دیکھا تو یہ دیکھا کہ بندر ایک نئی صورت کے جانور کو اُٹھا کر بھاگے ہیں۔ فوراً زٹیل دے کر جنگل کو ہوشیار کرنا چاہا۔ کہ اتنے میں زلفی نے پنچھیوں کا منتر پڑھ پھونکا۔ چیل متوجہ ہوئی۔ کہ کچھ اور کہے تو سنوں مگر اس عرصہ میں درختوں نے زلفی کے مُنہ پر پردہ ڈال دیا۔ چیل بھی شہباز کی خالہ تھیں۔ بازو کے ایک اشارہ میں رُخ بدل درختوں کے اوپر اوپر اُسی رستے پڑلیں جس رستے بندروں کا گارد قیدی کو لئے جاتا تھا۔

اتنے میں پتّوں کی اوٹ سے زلفی کا مُنہ نکلا۔ اور اُس نے پُکار کر کہا۔ چیل۔ اچھی چیل۔ اونچی چیل۔ تیری آنکھوں میں کاجل۔ میرا کھوج لیتی جا۔ پربت کے گھبرے اور سیونی کے بھالو کو میرا حال

جا سُنا"

چیل نے پوچھا "کس کی طرف سے بیٹا۔ کس کی طرف سے" چیل نے زلفی کا حال تو سُنا تھا مگر صورت نہیں دیکھی تھی۔

زلفی نے جواب دیا "میری طرف سے۔ میری طرف سے۔ زلفی میرا نام ہے۔ پیار سے مینڈک بھی کہتے ہیں۔ اور بچّۂ آدم کے نام سے جنگل میں مشہور ہوں۔ چیل۔ اچھی چیل۔ پیاری چیل۔ تیرے گھر میں پارس۔ میرا کھوج لیتی جا .... لیتی جا .... بھالو"

یہ آواز چیل کے کانوں تک اُڑتی سی پہنچی۔ کیونکہ بندر ایک چوٹی سے دوسری چوٹی کی طرف اُڑ چکے تھے۔ لیکن چیل مطلب سمجھ گئی۔ اور جھٹ دُم کی پتوار موڑ بازو مارتی ہوئی حلقہ باندھ ایسی اونچی اُڑی کہ دیکھتے ہی دیکھتے تارا ہو گئی۔ اور جب اُس بلندی پر پہنچی تو کچھ دیر قیام کیا۔ اور دونوں آنکھوں کی دُوربین لگا کر دیکھنے لگی۔ کہ درختوں کی شاخیں کس طرح ایک ہی سمت میں جھومتی چلی جاتی ہیں۔ اور دل میں کہنے لگی "یقینی یہ ہی کھوج ہے اُن لٹیروں کا جو زلفی کو لے کر بھاگے ہیں"

کچھ دیر کے بعد دیکھا۔ تو درختوں میں حرکت نہیں رہی تھی۔ جی ہی جی میں ہنسکر بولی" ارے واہ رے لے پڑ کے بھگوڑو! تمہاری بھ

وہی مثل ہے۔ کہ نو دن میں چلیں اڑھائی کوس۔ بڑی منزل ماری تو دس، پانچ کوس چل کر کندھا ڈال دیا۔ کام دن بھر میں سو بچارو اور نبڑے ایک نہیں + اب تو وہ جوانی کی نظر کہاں رہی۔ پر ہماری منقار پر بھی دیدے ہیں تو دکھا دینگے۔ کہ آج کے کیئے کا بہت برا پھل چکھوگے + بھالو پھر بھالو بھوٹان کا ریچھ ہے۔ فاختہ کی دُم نہیں + رہا بگھیرا۔ تو اُس کو کون نہیں جانتا۔ گردن میں زنجیر پڑ گئی ہو۔ تو خبر نہیں۔ لیکن ہاتھوں میں چوڑیاں پہنے نہیں دیکھا"

چیل نے دل ہی دل میں یہ باتیں کر کے دُم کے نیچے پنجے سمیٹ لئے۔ اور بازو چلا کر اونچی اُڑنی شروع ہوئی لیکن پھر کچھ سوچا اور فوراً پروں کو تان کر چپ چاپ منڈلانے لگی۔ اور یہ علامت تھی کہ کسی بات کا سخت انتظار ہے +

اب بھالو اور بگھیرے کا حال سُنئے کہ اس عرصہ میں زلفی کے پیچھے وہ بالکل دیوانے ہو گئے تھے۔ بگھیرا درختوں پر ایسا بے دریغ چڑھتا تھا۔ کہ اِس سے پہلے کبھی اُس کو اتنی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن کمزور شاخیں بوجھ سے ٹوٹ پڑتی تھیں۔ اور یہ دل میں حسرت لئے اور پنجوں میں بکل چھال نوچتے ہوئے نیچے آن رہتے تھے۔ غصہ تو اپنی بے بسی اور بے کسی پر آتا تھا اور ڈانٹتا تھا بیچارے بھالو کو " ارے گرو۔ کمبل کے پوٹلے۔ پہلے ہی لونڈے کو کیوں

نہ خبردار کر دیا۔ کہ آج اِس مصیبت میں نہ پڑتا + جب تجھ سے اِتنا بھی نہ بنا یا گیا۔ تو تو اُس غریب کو پیٹا کیوں کرتا تھا؟

بھالو کو بات سُننے یا جواب دینے کا ہوش کہاں تھا۔ روتا پیٹتا گرتا پڑتا۔ لوٹتا لڑھکتا چلا جاتا تھا کہ شاید بندروں کو پکڑ لے۔ دوڑتے دوڑتے دَم پھُول گیا تھا۔ اور پیٹ کا پانی اِس طرح بولتا تھا۔ جیسے سقّے کی ادھ بھری پکھال + گھبرا جب کوئی بات پوچھتا۔ ہانپتا کانپتا یہ ہی جواب دیتا۔ کہ "چلا چل بھیّا۔ چلا چل۔ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے"۔

گھبرا۔" جانے کو اب رہا کیا ہے۔ جس چال سے آپ جا رہے ہیں۔ اِس چال سے تو لنگڑے ٹٹّو کو بھی پسینہ نہیں آتا۔ مگر آپ تھوڑی دیر میں پانی ہو کر بہ جائیں گے۔ لونڈوں کو پیٹنا ہی سیکھا تھا یا کچھ اَور بھی آتا ہے؟ گرو گھنٹال۔ اگر آدھ کوس بھی اس طرح اَور سڑک پر بیلن پھیرتے چلے۔ تو پیٹ پھٹ کر اوجھ نکل پڑے گا + ذرا بیٹھ کر سستا لو۔ اور سوچ لو کہ کیا کرنا ہے۔ بندروں کا پیچھا نہ تُم سے ہوگا۔ اور نہ پیچھا کرنے سے کچھ حاصل۔ اور جو اُن تک پہنچ بھی گئے۔ اور تمہاری صورت دیکھتے ہی اُنھوں نے لونڈے کو نیچے پھینک دیا۔ تو آپ کی یہ برسوں کی کی کرائی کمائی سب خاک میں رل جائے گی"۔

بھالو۔ بگھیرے کے مُنہ سے یہ فال سُنتے ہی بکھر گئے اور لگے چلاّنے "ارے باپ رے باپ۔ کون جانتا ہے کہ اب تک گرا کر ہڈّیاں چورا نہ کردی ہوں گی۔ ارے میرے زلفی۔ میرے لال۔ بندروں نے تجھے کب جیتا چھوڑا ہوگا۔ ارے کیا کروں جنگل والو تم ہی کچھ بتاؤ۔ چھچھوندر جیسا جاؤں۔ نگلوں تو اندھا۔ اُگلوں تو کوڑھی۔ قہرن کو کیا مُنہ دکھاؤں گا کوئی طیاقی ہی سے کہ وہ کنبے والوں کو لاکر مجھے جیتا نگل جائے + مُہال کی مکھیو۔ تم ہی آکر قصّہ پاک کر دو۔ زلفی میرے کندھوں کے سوار۔ اس دن کی کسے خبر تھی۔ تیرا سر تو روز کچلوں۔ اور بندروں سے تجھے خبردار نہ کروں۔ اور جو تم نے بھالو کے ساتھ جنگل کے منتر بھی بھلا دئے۔ تو اب جنگل میں تمہارا پوچھنے والا کون رہا"؟

بھالو غریب روتا تھا۔ اور کنپٹیوں کو پنجوں سے پکڑ کر زمین پر لوٹتا تھا۔

بگھیرا یہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ اور بولا "ہائیں ہائیں گروجی اتنی بدحواسی! ذرا ہمّت سے کام لو۔ یوں خارپشت کی طرح گولا بن کر لڑھکنے سے کیا حاصل ہو۔ جنگل والے کیا کہتے ہوں گے"!

بھالو۔ جس کا جو جی چاہے سو کہے۔ اب مجھے کسی سے کیا۔ زلفی جیتا ہوتا تو سب کچھ تھا"۔

بگھیرا۔ اگر یونہی تماشا دیکھنے کے لئے مارڈالا ہو۔ تو اس کی تو کہنا نہیں

باقی کچھ فکر نہ کرو۔ لڑکا بہت عقل مند اور ہوشیار ہے۔ اور اُس کی آنکھ
میں ایسی قوت ہے کہ کوئی جانور اُس کو ہلاک نہیں کر سکتا۔ لیکن پھر بھی
بندر کا قیدی اور بندر کا زخم برابر ہیں۔ مگر اس کا کیا علاج! وہ پیڑوں کے
رہنے والے ہم زمین کی خاک چھاننے والے۔ تدبیر ہو تو کیا ہو؟" یہ کہکر بگھیر
دُم سے جھاڑ دے زمین پر بیٹھ گیا۔ اور فکر سے دونو پنجے چاٹنے لگا۔
بگھیرے کے کہنے سُننے سے ریچھ کے حواس کسی قدر درست ہوئے
اور یا تو خاک پر پڑا لوٹ رہا تھا۔ یا ہلکی سی جھُرجھُری لے کھڑا ہو گیا۔ مگر
نہایت زار و نزار اور بگھیرے سے کہنے لگا "سچ ہے جب بُرا وقت آتا
ہے تو جانور نرا ریچھ رہ جاتا ہے۔ بلکہ گھسیارے کا موٹا جھوٹا کمبل کھُر
نہ جالی۔ پنجوں سے جڑیں کھودو اور کھاؤ اب کچھ یاد آتا ہے۔ کہ
گجپال ہاتھی نے ایک دن کہیں کی کہاوت کہی تھی کہ ہر "فرعونے
را موسیٰ" بندروں کی اکسیر اژدہے کے پاس ہے۔ وہ بھی ان کی
مومیائی خوب تیار کرتا ہے۔ سمجھے بھی کون سا اژدہا؟ وہ ہی بابا جی
اجگر جو کالے پہاڑ والے کر کے بھی مشہور ہیں۔ درختوں پر چڑھنے کی
مہارت اُن کو بندروں سے بڑھ کر ہے۔ اور جب تک رات کو مُنہ میٹھا کرنے
کے لئے دو چار بندریوں کے بچّے نوش نہیں کر لیتے کمر سیدھی نہیں کرتے
اور اُن کے نام کی وہ تاثیر ہے۔ کہ اگر کوئی جھوٹ موٹ بھی کہدے کہ وہ "اژد
آیا" تو اُن بے ایمان بندروں کی شریر رُومیں تک ٹھنڈی پڑ جاتی ہیں۔ بس

اب یہی مناسب ہے کہ اژدہے سے چل کر فریاد کریں ؟"

بگھیرا۔ اجی اژدہا کیا کرے گا۔ مفت میں اوقات خراب ہو گی۔ وہ خاک کا لوٹنے والا۔ بن پاؤں کا روگی۔ کوئی ہمارے پنہنہ کا ہے کہ اِس آڑے وقت میں کام آئے گا ؟ اور پھر اُس کی نظر خدا کی پناہ ! نہایت خوفناک ہے ؟"

بھالو۔ بڑھاپے میں کِس کی نظر رہتی ہے۔ اب وہ جوش جوانی کہاں البتہ چستی و چالاکی بدستور قایم ہے۔ اور یہ کیسا وصف ہے۔ کہ بارہ مہینے بھوکا رہتا ہے۔ بھیّا بگھیرے جو کچھ ہو۔ اب تو اژدہے کے پاس چلنا ضرور ہے۔ اِس وقت اَور کیا ہو سکتا ہے۔ دو چار پہاڑی بکریاں ہی بھینٹ چڑھاویں گے۔ کسی طرح کام تو نکلے ؟"

بگھیرا۔ اور جو وہ سوتا ہوا ؟ سُنا ہے ناشتہ کرتے ہی سو جاتا ہے اور پورے ایک مہینے تک پڑا سویا کرتا ہے۔ ممکن ہے اس وقت خواب نوشیں میں ہو۔ اور جو ہمارے کہنے سُننے سے اُٹھا بھی اور کہ دیا۔ کہ آپ کی نذر قبول نہیں کرتے۔ ہمیں بکریوں کی کمی نہیں۔ تو پھر کیا ؟ اپنا سا مُنہ لے کر واپس آنا پڑے گا ؟"

بگھیرے نے یہ خواہ مخواہ کے اعتراض اِس وجہ سے پیدا کئے تھے۔ کہ اژدہے کے حالات سے واقف نہ تھا۔ اور ناواقفیت کی حالت میں حیوان کو حیوان سے جس قدر بدگمانی ہو کم ہے ؟

بھالو:۔ واہ تم بھی پُرانے شکاری ہو کر کیسی بات کہتے ہو۔ اِنکار کیا تو کیا ہے۔ اب ایسے بھی ہم بالکل گئے گذرے نہیں ہیں۔ یوں نہ سمجھا تو اَور طرح پر سمجھانے کو موجود ہیں"۔ یہ کہہ کر بھالو نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اُس واجب التعظیم بھوری پوستین کا نشانہ جو آج مٹّی میں لتھڑ کر بہت ڈھلک گیا تھا۔ بگھیرے کے کندھے سے لڑا کر کہا۔ "چلتا بھی ہے میرے یار۔ یا یہیں کھڑا کھڑا بال بنائے جائیگا"۔ کندھوں کے لڑتے ہی دونو جوان باباجی اجگر کے استھان کا ارادہ کرکے چل پڑے۔

باباجی اجگر کے دوارے

کالے پہاڑ پر پہنچتے ہی دُور سے دیکھا کہ باباجی ابھی ابھی موکھے سے نکل کر چٹان کے چھجّے پر دھوپ کھانے نکلے ہیں۔ مدّت سے چلّہ کھینچ رہے تھے۔ آج ہی کینچلی بدل کر باہر آئے ہیں۔ کہ ذرا اُجالے میں بیٹھ کر نیا روپ دیکھ لیں۔ پھن سے لے کر دُم کی نوک تک ایک انچ کم نہ زیادہ۔ پورے تیس فٹ کے تھے۔ جس کے نمبری حساب سے دس گز ہوئے۔ وزن کا حساب بتانا مشکل ہے۔ مگر پیٹ پر سے اتنے موٹے تھے۔ کہ اچھے خاصے جوان بندر کی کولی میں مشکل سے آتے۔

اب رہا رنگ روپ تو بس اِس کا حال نہ پوچھئے۔ سُنہری زمین پر رُوپے کا باریک ماہی جال اور اُس پر سیاہ زنجیرے میں چھپئی گُل بُوٹے۔ ڈھلتے سورج کی کرن میں پہاڑ پر بجلیاں کوندا رہے تھے۔ اور یہ کالے پہاڑ والے جوبن کی ترنگ میں اینٹھ اینٹھ کر بیس ہاتھ کا موٹا رسّا بڑی آب و تاب سے بٹ رہے تھے۔ بل پر بل کھا کر طرح طرح کی کُنڈلیاں مارتے تھے۔ مگر کسی نشست پر قرار نہ تھا۔ کبھی لہر میں آکر اپنے ہی ڈھیر پر قدِ آدم بلند ہو جاتے۔ اور محض سُستی اُتارنے کے لئے دو دو چار چار گز پیچھے ہٹ کر پتھروں پر پھن کی موگریاں مارتے اور جب ناشتہ کا خیال آتا تو جلدی جلدی زبان نکال کر ہونٹ چاٹنے لگتے تھے ؛؛

اژدہے کو دُور سے دیکھتے ہی بھالو نے کہا " بھیّا گھبیرے شکر کرو۔ کہ ابھی تک کھانے کو کچھ نہیں ملا ہے۔ ذرا ہوشیار رہنا۔ کینچلی بدل کر نکلتے ہیں۔ تو ذرا سوجھنا کم ہے۔ اور چوٹ کرنے میں بھی جلدی کر جاتے ہیں ؛؛

اژدہا بھی ایک قسم کا سانپ ہے۔ لیکن زہریلے سانپوں میں اُس کا شمار نہیں + زہریلوں کا ہنر اُن کے دانت ہیں۔ اور زہر کے چھالے۔ اور اژدہوں کی قوّت بدن کے جوڑوں میں ہے۔ کہ جس جانور پر لپٹ کر چھپّن جوڑ کس دئے۔ پھر اُس مرحوم کا ذکر صرف

ـمانیوں میں رہ جاتا ہے"۔
بھالو نے دور ہی سے اژدہے کو سلام کیا۔ اور پُٹھوں کے بَل
ـوب سے ہو بیٹھا۔ ثقلِ سماعت اُونچا سُننے کا مرض جو اژدہوں کی
ـنسل میں مدّت سے چلا آتا ہے۔ باباجی میں بھی موجود تھا۔ کسی کا
ـسلام سُننے تو جواب بھی دیتے۔ لیکن کچھ آہٹ پاکر پورے اٹھارہ
ـہاتھ نہ ہو گئے۔ اور کنڈلی پر گز بھر سیدھے ہو کر گردن پیچھے کو ڈال
ـپھن آگے بڑھا لیا۔ کہ اتفاق ہی تو ہے۔ خدا جانے کیا موقع بیٹھ
آئے۔
اور اب چُندھی چندھی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر بولے"۔
"سلام بھیّا۔ سلام آہا۔ بھالو ہیں۔ سیونی والے + کہئے کیسے آنا
ہُوا؟ اور اچھّا آپ بھی ہیں۔ بھبھیرے پربت والے۔ خوش رہو
شکاری۔ خوش رہو۔ پیٹ تو اس وقت ایک نہ ایک کا ضرور خالی
ہو گا۔ کہو کچھ شکار و کار کے بچن بھی نکالے؟ کوئی بھیڑ۔ بکری۔
ہرنی۔ منڈائن۔ جنگل میں کچھ ہے بھی۔ یا سارا بن سُونا پڑا ہے؟
یہاں تو اوپر سے لے کر نیچے تک ایسے خالی پڑے ہیں جیسا
اندھا کنواں"۔
بھالو "جی ہاں۔ ہم بھی شکار ہی کھیلتے کھیلتے اِدھر آ نکلے ہیں"۔
بات بچا کر کہنی بھی جھوٹ میں داخل ہے۔ مگر کچھ اژدہے کے مزاج

سے واقف تھا۔ کہ ڈیل ڈول زیادہ رکھتے ہیں۔ جلدی ہیں اُن سے کوئی کام نکل نہیں سکتا ۔

اژدہا۔ اچھا گرو کو بھی شکار کا شوق ہو گیا۔ ساتھ تو اچھا ہے پھر کہو تو ہم بھی چل پڑیں ۔ تم جوانوں کا کیا ہے۔ اِس کھونٹ نہ ملا دوسری کھونٹ چھاپہ جا مارا۔ مشکل تو ہماری ہے۔ وہ ہی کہاوت ہے کہ "اجگر کے داتا رام"۔ ہمیں اَور کون پوچھے فکر شکار میں بٹیا کے کنارے اِس سرے سے اُس سرے تک پڑے پڑے اٹھوارے گذر جاتے ہیں۔ اور کچھ نہیں ملتا۔ ایک ایک جوان بندر کے لئے آدھی آدھی رات پیڑ پر چڑھنے میں گذر جاتی ہے۔ اور پھر خالی پیٹ کھسکنا پڑتا ہے۔ جنگل کا یہ حال ہے۔ کہ لکڑی میں ذرا جان نہیں۔ ایک روکھ ہماری جوانی کے تھے۔ کیسے ہرے بھرے لکڑی کے مضبوط۔ ایک آج کل کے ہیں کہ ایندھن بھی اِن سے اچھا ہوتا ہے ۔

بھالو۔ پنجے جوڑ کر بولے "ست بچن مہاراج۔ پیڑ تو اب بھی خاصے ہیں۔ یہ کہیے کہ آپ ہی کا وزن بڑھ گیا ہو گا"۔

اژدہا ہنس کر بولا۔ "وزن تو خیر کیا رہا ہے۔ قوٰے البتہ اچھے ہیں۔ اور وہ بھی اچھے کیا ہیں۔ یہ کہیے کہ بڑوں کا نام قایم ہے۔ اور سچ پوچھیے تو قصور قوٰے کا ہے نہ وزن کا ساری خرابی اِس نئی

پوو کے جنگل کی ہے۔ جو ہمارے تمہارے دیکھتے جوان ہوا ہے۔
اگلے وقتوں کے بن کہیں ایسے ہوا کرتے تھے۔ تھوڑا ہی عرصہ
گذرتا ہے۔ کہ ایک دن گرتے گرتے بچا۔ جڑ پر دُم جما کر پیڑ پر چڑھتا
تھا۔ تھوڑی ہی دُور پہنچا تھا کہ جڑ چٹخی اور جڑ کے چٹختے ہی دُم نے
گرفت چھوڑ دی۔ جب جڑ کا یہ حال ہو۔ تو ڈالوں کا کیا حال پوچھنا
ہے۔ سب کی سب جھکنے لگیں۔ لاچار بے قابو ہو کر پھسلنا پڑا۔
پھسلنے کی آواز سُنتے ہی بندر ہوشیار ہو گئے۔ اور مجھے دیکھتے ہی
ایسے ایسے ناشایستہ الفاظ زبان پر لائے ہیں۔ کہ اب تک غصّے
سے بدن کا جوڑ جوڑ اینٹھ رہا ہے۔ کہ اگر ان بندروں کو کہیں پا لے۔
تو ایک ایک کا رس نکال کر پھوک کی طرح پھینک دے"۔

بگھیرا یہ سُنتے ہی کچھ مونچھوں ہی مونچھوں میں بڑبڑا اُٹھا
"ارے واہ رے کیڑے۔ تجھے بھی کیا دن لگے ہیں"۔ اِس کی
کچھ اچٹتی سی بھنک اژدہے کے کان میں بھی پڑی اور جھٹ
پھن اُٹھا کر بولا"۔ ہیں! یہ کیا لفظ آپ نے کہا۔ پھر تو کہئے"؟

بگھیرا "جی کچھ نہیں۔ اِن شریر بندروں کے ناشایستہ الفاظ
کچھ یاد آ گئے تھے۔ حقیقت میں نہایت گستاخ ہوتے جاتے ہیں۔
مجھے بھی کچھ یاد پڑتا ہے کہ کوئی ایسا ہی سخت لفظ مینڈکی کا یا مٹی سے
بدتر کسی چیز کا کیڑا آپ کا نام رکھا ہے"۔

اژدہا غصّے سے پھول اُٹھا اور پھُنکارے مار کر پوچھنے لگا۔ "ور کیا نام رکھا ہے۔ پھر تو کہو۔ مٹّی کا کون؟ یہ لفظ اور ہماری شان ہیں اور وہ بھی بندروں کے مُنہ سے!"

بگھیرے نے چبا چبا کر کہنا شروع کیا "جی ہاں۔ کوئی ایسا ہی لفظ تھا۔ پچھلے ہی چاند کا تو ذکر ہے۔ کم بخت نہایت بے باک ہوگئے ہیں۔ پرسوں ہی دوپہر کو پیڑوں میں بیٹھے پرچے دوڑا رہے تھے۔ کہ آپ کے دانت ٹوٹ گئے ہیں اور آپ بالکل پوپلے ہوگئے ہیں۔ اور سوائے بکری کے بچّہ کے وہ بھی جو دودھ پیتا ہو۔ اب آپ کسی چیز کے قابل نہیں رہے۔ کیا عرض کروں۔ یہ بندر نہایت بے ادب اور گستاخ ہیں۔ روز بزرگوں کا مضحکہ کرتے ہیں۔ خود ہی سوال کرتے ہیں۔ اور خود ہی جواب دیتے ہیں۔ ایک صاحب نے آپ کی اس معذوری کی وجہ پوچھی تو دوسرے صاحب بولے کہ اگر آپ پہاڑی بکرا نگل جاتے ہیں۔ تو سینگ حلق میں پھنس جاتے ہیں۔ اور پھر آپ کی بُری گت بنتی ہے۔ اور اِس بات پر یہ نامعقول سب قہقہے لگا کر ہنسنے لگے"

اژدہے کے غصّے کو پہچاننا ذرا مشکل ہے۔ لیکن وہ تو شکاری تاڑ گئے کہ مطلب نکل آیا۔ اژدہے کے گلپھڑے کبھی پھولتے ہیں۔ کبھی پچکتے ہیں اور نتھنوں سے بھاپ نکلنے لگی ہے۔

جب ذرا پھنکاروں کی دھوکنی ٹھہری۔ تو اژدہے نے بھالو

سے پوچھا " معلوم ہوتا ہے۔ آج بندروں نے کسی طرف کوچ کیا ہے۔ تھوڑی دیر ہوئی پیڑوں میں غل سا ہو رہا تھا"۔

بھالو۔ جی ہاں۔ اِن ہی..... بندروں..... کے پیچھے تو ہم بھی خاک چھان رہے ہیں "۔ بھالو نے یہ فقرہ کہنے کو تو کہ دیا لیکن بندر کا نام حلق میں اٹک سا گیا۔ جیسے کسی نے گلا پکڑ لیا ہو۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جنگل کے کسی شریف جانور نے بندروں کے افعال سے باضابطہ بحث کی ہو۔

اژدہا " ہائیں۔ آپ اور بندروں کا تعاقب؟ خود شکاری نہ سہی۔ مگر شکاریوں کے اُستاد۔ دونو صاحب جنگل کے شریف زادے اپنی اپنی قوم کے سردار۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کوئی نہایت سخت مرحلہ درپیش ہے؟"

بھالو نظریں نیچی کرکے بولے " جی۔ کس کا شکار اور کس کی شرافت۔ یہ ناچیز تو محض ایک بھوری رنگت کا ریچھ ہے۔ اور اب تو ریچھ بھی نہ رہا۔ بقول شخصے " یک مشت پشم " وہ بھی " از پشت ِ میش " رہ گیا ہے۔ سیونی کے جنگل میں بھیڑیوں کی اولاد کو پڑھاتا ہے۔ ایک مسکین سا معلّم ہے۔ جس سے آٹھویں دسویں کوئی نہ کوئی حماقت ہوتی رہتی ہے۔ البتہ یہ میرے ساتھی بے چارے ..."

بگھیرا کسر نفسی کا قایل نہ تھا۔ جھٹ منہ پھاڑ۔ کچلیاں نکال زمین پر پنجہ مار بیچ میں بول اُٹھا "ایں جانب فقط بگھیرے ہیں "بیک کلہ و چہار چنگل۔ کورے سپاہی آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا" یہ کہ کر کھٹ سے منہ بند کر لیا۔ اور اژدہے سے للکار کر کہا کہ "اے اژدر کوہسار سن لے۔ ہماری داستان بہت مختصر ہے۔ تیرے ان بندروں نے کہ پیڑوں کے رہزن۔ پھل پھلواریوں کے چور۔ باغوں کے لیٹرے اور جنگل کے قزاق ہیں ہمارا آدمی کا بچّہ چُرا لیا ہے۔ جس کو ہم نے بڑے شوق سے پالا تھا۔ اور اس آمی کے بچّے کا حال تو نے بھی ضرور سُنا ہوگا"

اژدہا "اچھّا اچھّا۔ کہیں اُسی جانور کے بچّے کو تو آپ نہیں کہتے جس کا ایک دن ساہی ذکر کرتی تھی۔ ساہی! ڈہی کانٹوں والی خارپشت کی ساس جو جھڑبیری میں رہتی ہے۔ کم بخت لڑائی کا گھر ہے۔ دنیا بھر کے قصّے اِس کی زبان پر رہتے ہیں۔ مگر آج تک بات پوری سنتی آئی نہ کہتی۔ وہ ہی ایک دن کانٹے پھیلائے دھوپ میں بیٹھی کہ رہی تھی۔ کہ سیونی کے بھیڑیوں نے آدمی کا پلّا پالا ہے۔ بات تو میرے کان میں بھی پڑی تھی مگر کچھ یقین نہ آیا تھا۔

بھالو۔ مگر اب یقین کر لیجئے۔ وہ بچّہ آدمی کا بچّہ ہے۔ اور بچّہ بھی ایسا۔ جس کی مثل آج تک جنگل نے نہیں دیکھا تھا۔ نہایت

عاقل و زیرک۔ اور پھر میرا شاگرد ہے۔ جو اُستاد کے نام کو جب تک اس سنسار میں سیونی کا جنگل قایم ہے روشن رکھے گا اور اس کے علاوہ مجھ کو اور نہ صرف مجھ کو بلکہ ہم دونو کو اس معصوم بچّے کے ساتھ غایت درجہ الفت بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ عشق ہے!!!

اژدہا۔ "عشق۔ پھُو پھُو۔ کس مرض کا نام لیا۔ ہم بھی اِس آزار میں مدتوں مبتلا رہے ہیں۔ اِس کے قصّے ہم سے سُنئے" ع

کوئی میرے جی سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کی

بگھیرا۔ "قصّے تو جناب کو بے شک بہت یاد ہوں گے لیکن اُن کے کہنے اور سُننے کا لطف تو جب ہے۔ کہ چاندنی رات ہو۔ وہ بھی پورے چار پہر کی۔ نرم اور لذیذ شکار سے شکم ہائے احباب تا بحلقوم پُر ہوں۔ پھر فتراک بلا کے اسیروں کا تڑپنا اور لوٹنا ہماری زبان سے سُنئے۔ اِس وقت مضمون واحد ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہمارا آدمی کا بچّہ بندر اُٹھا لے گئے اور بندر آپ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ جس طرح ہو سکے ہمارا بچّہ اُن سے دلوا دیجیئے"!!

اژدہا۔ "خوب! خوب! اس کو تو پھر آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بندر میرے سوا کسی کا خوف نہیں کرتے + اب آپ سے اِن بندروں کا حال کیا عرض کروں۔ جنگل میں کوئی مخلوق اِن سے زیادہ احمق۔ مغرور اور یاوہ گو۔ ان سے بڑھ کر خود بیں۔ خود ستا و خود نما نہیں +

بھنبیرا چاہتا ہوں کہ ان کو تمیز سکھاؤں۔ لیکن سوائے اِس کے کہ اپنا
ہی معدہ خراب کر کے بیٹھ رہوں۔ اُن پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ بندر کے
ہاتھ آرسی۔ کچھ شک نہیں کہ اِس بچّے کی آج بُری گت بنی ہوگی +
پھل جن کو وہ بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ جب اُن کو توڑتے
توڑتے اُکتا کر پھینک دیتے ہیں۔ درخت کی ایک معمولی شاخ جس
کو ایک جگہ سے گھسیٹ کر دوسری جگہ لے جانے میں آدھا آدھا
دن گنوا دیتے ہیں۔ اور پھر اُس کو نوچ کھسوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر
ڈالتے ہیں۔ تو پھر ایسی عجیب چیز جیسے آپ کا آدمی کا بچّہ ہے۔
اُن کے ہاتھوں سے کب سلامت رہ سکتا ہے؟ افسوس! ہاں
ذرا یہ تو فرمائیے۔ میری نسبت اِن شہدوں نے کیا لفظ کہا تھا۔
بھول بھول جاتا ہوں"۔

بگھیرا چلّا کر بولا "کیڑا، کیڑا۔ اور کیڑا بھی .... خیر مٹّی ہی کا
سمجھئے۔ ایک بات ہو تو کہی جائے۔ بیسوں باتیں آپ کی نسبت مشہور
کر رکھی ہیں۔ مجھ کو تو کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے"۔

اژدہا۔ "اچھّا اچھّا! اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔
آپ خود ہی تماشا دیکھ لیجئے گا۔ کہ ان گستاخوں کو کس طرح تمیز سکھاتا
ہوں۔ بہت دنوں سے بھولے بیٹھے ہیں۔ یہ بتائیے کہ اُس بچّہ کو
کس طرف لے گئے ہیں؟"

بھالو۔" جنگل میں جانے کدھر لے گئے ہیں۔ جدھر سورج ڈوبتا ہے۔ اُدھر کچھ پتا چلتا ہے۔ ہم تو سمجھے تھے کہ آپ کو سب خبر ہو گی"۔

اژدہا۔" مجھے بھلا کیا خبر ہو سکتی ہے۔ میں ایسے کمینوں کے پیچھے تو پھرتا نہیں۔ رستہ میں کہیں دس پانچ مل گئے تو کھا لیئے۔ کیا آپ سمجھے تھے۔ کہ ایسے ذلیل شکار کے لئے مجھے کوئی تردد کرنا پڑتا ہے؟"

سُراغ

"چل چل چلو چلو۔ بھالو اوپر دیکھ۔ بگھیرے اوپر دیکھ"۔

بھالو نے گردن اُٹھا کر اوپر دیکھا۔ تو چیل چکر باندھے نیچے اُتر رہی تھی۔ شہ پروں کے سفید استر پر سورج کی کرن ہے۔ گردن اور پشت کے پَر ہوا سے پریشان ہیں۔ منقار جھکی ہے۔ بسیرے کا وقت قریب ہے۔ اور پورا ایک پہر ہونے کو آیا ہے۔ کہ بھالو کو جنگل میں ڈھونڈتی پھری ہے۔ اب شام ہوتے پہاڑ پر نظر پڑی۔ تو بھالو کو آواز دے کر نیچے اُترتی ہے کہ مظلوم قیدی کا پیغام سُنا دے۔

بھالو گھبرا کر دونو پنجوں پر کھڑا ہو گیا۔ اور چیل زفیل دے کر

بولی" بھالو سیونی والے سن لے کہ تیرا زلفی بندروں کی قید میں ہے۔ دریا پار سرد ویرانوں کی طرف جہاں کہ انسان کا بنایا ہوا ایک شہر صحرا کے دامن میں برباد پڑا ہے قیدی کو لے گئے ہیں۔ یہ نہیں معلوم۔ وہاں کب تک قیام ہو۔ شپّر کو رسے کہ آئی ہوں۔ کہ جب تک جنگل میں اندھیرا ہے قافلہ کی نقل و حرکت سے خبردار رہے۔ اور بس یہ ہی خبر تھی۔ جو سنانے آئی تھی۔ اب میں جاتی ہوں بسیرے کا وقت قریب ہے۔ بچے روتے ہونگے"۔

بھالو جی تو اتنی خبر سنتے ہی خوشی سے بے دم ہو کر خاک پر گر پڑے اور بگھیرا چراغ پا کر چیل سے کہنے لگا" اے چیل۔ چیلوں کی ملکہ۔ جب تک جنگل آباد ہے۔ تو اور تیرے بچے سلامت رہیں۔ قلۂ کوہ پر آشیانہ بلند رہے۔ اونچی سینچ پر سونا نصیب ہو۔ پوٹے میں چارہ۔ پروں میں قوت۔ پنجوں پکڑے اور چونچوں کھائے! جو سلوک آج تو نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔ جنگل تجھ کو اس نیکی کا اجر دے! اب کے جس دن ہرن شکار کیا دل و جگر تیری نذر کروں گا؟"

چیل" اتنا شرمندہ نہ فرمائیے۔ میرا اس میں کون سا بڑا کام تھا۔ تعریف تو اُس لڑکے کی ہے۔ کہ دُور سے دیکھتے ہی مجھے پہچان لیا۔ اور اپنا سارا حال سُنا دیا" اور یہ کہ کر چیل بسیرے کے لئے آشیانہ کی طرف اُڑ گئی۔

بھالو فرط طرب میں خاک پر لوٹ پیٹ کر پوستین جھاڑتے ہوئے اُٹھے۔ تو بگھیرے سے کہنے لگے "دیکھیے۔ دیکھیے۔ کیا ذراسی جان ہے۔ اور کس مصیبت میں گرفتار ہے۔ اور پھر بھی منتر نہ بھولا"۔

بگھیرا "کیوں نہیں۔ بھلا آپ کے یاد کرائے ہوئے منتر جیسے سر میں میخیں ٹھونک دیں۔ مجال ہے دماغ سے نکل جائیں! اب خیر سے کھڑے ہو جائیے۔ اور سرد ویرانوں کی طرف کوچ بول دیجیے"۔

اس جگہ کو سیونی کا بچّہ بچّہ جانتا تھا۔ کہ کہاں ہے۔ لیکن یہ مقام ایک ویران شہر تھا۔ جس کے چاروں طرف بن کھڑا ہوگیا تھا۔ کسی زمانہ میں وہاں انسان کی بود و باش تھی۔ مگر اب کچھ عرصہ سے بندروں نے باوجود اس خانہ بدوشی کے اپنا مولد اور مسکن مشہور کر دیا تھا۔ اس لئے سوائے لومڑیوں اور گیدڑوں کے جنگل کا کوئی شریف شکاری جانور۔ وضع کا پابند اس ویرانہ کے پاس تک نہ پھٹکتا تھا۔ البتہ گرمی کے موسم میں جب جنگل میں پانی کا قحط ہو جاتا۔ تو یہاں کے پختہ تالابوں اور سنگین حوضوں سے جن میں برساتی پانی کسی قدر باقی رہ جاتا تھا۔ بعض درندے پیاس بجھانے چلے آتے تھے۔ اور غالباً یہ ہی وجہ تھی کہ یہ برباد شہر سرد

ویرانوں کے نام سے جنگل میں مشہور ہوگیا تھا ۔

بھالو چلنے کو تیار ہؤا تو بگھیرا بولا "گرو جی ۔ چلنے کو تو تیار ہو گئے ۔ کچھ منزل کی بھی خبر ہے ؟ پوری آدھی رات دوڑنا پڑے گا "۔

بھالو نے کہا " تم چلو تو ۔ آج بھی ان ہاتھ پاؤں نے کام نہ دیا تو پھر کس دن کام دیں گے ؟"

بگھیرا " بجا ہے ۔ یہ کہئے کہ اور دن تو کچھ کام دے بھی جاتے ۔ آج کیا کام دیں گے ۔ بہتر یہ ہے کہ میں اژدہے کے ساتھ چلتا ہوں ۔ آپ پیچھے آتے رہئے گا ۔ پاؤں تو اژدہے کے بھی نہیں ہیں ۔ مگر خیر ۔ ہم دونوں کسی طرح پہنچ رہینگے "۔

اژدہا یہ سن کر بولا " واہ کیا خوب ! پاؤں ہوں یا نہ ہوں اپنے سے چار بانس آگے دیکھ لینا " یہ کہ کر بگھیرے کے ساتھ اژدہا بھی چل پڑا ۔ بھالو بھی کچھ دور ساتھ چلا ۔ مگر تھک کر بیٹھ گیا اور اب اب اژدہے اور بگھیرے میں دوڑ شروع ہوئی ۔ اژدہا منہ بند کرکے شائیں شائیں کرتا تیر کی طرح چلا ۔ بگھیرا بھی اُچھلتا کودتا چوکڑیاں بھرتا روانہ ہؤا ۔ جب کبھی سوچتا تھا کہ آگے نکل گیا ہوں اژدہے کو دس قدم اپنے سے آگے ہی پاتا تھا ۔ کہ اتنے میں پہاڑی ندی زور سے بہتی ہوئی رستہ میں آئی ۔ بگھیرا ایک چھلانگ میں پار پہنچا ۔

اژدہے کو پانی میں اُترنا پڑا اور مشکل سے تیر کر بہت دیر میں کنارے پر نکلا۔ بگھیرا اتنی دیر میں بہت آگے بڑھ گیا تھا مگر اژدہا ایسا اُڑا۔ کہ تھوڑی ہی دیر میں بگھیرے کو جا پکڑا۔

شام تو ہو گئی۔ آسمان پر شفق پھولی اور سارا جنگل گلابی ہو گیا۔ گلابی روشنی میں اژدہے کی چمک دمک دیکھ کر بگھیرا لوٹ گیا اور رفتار کی تیزی پر عش عش کر کے اژدہے کی تعریف میں قسمیں کھانے لگا۔ کہ قسم ہے اُس قفل زندان کی جس کو ایک پنجہ میں توڑ کر اسیری سے آزاد ہوا ہوں۔ کہ اس طول طویل قدو قامت پر آپ کی مثل تیز گام نہیں دیکھا۔

اژدہا "جی ہاں۔ بھوک بُری بلا ہے اور جب غصّہ بھی ساتھ ساتھ ہو۔ ہاں ذرا۔ پھر تو فرمائیے کہ ان بندروں نے میری نسبت کیا لفظ کہا تھا۔ مینڈک یا مچھلی؟ وہ خاص لفظ کیا تھا؟"

بگھیرا دوڑتے دوڑتے یکایک تھم گیا اور چلا کر بولا "بیس دفعہ تو عرض کر چکا ہوں کتنی دفعہ سنئے گا؟ اب پھر سننے کو جی چاہتا ہے تو سنئے اور کسی قدر تفصیل سے سنئے۔ حشرات الارض میں سے ایک نہایت حقیر اور ادنٰے جان دار کا نام جو آپ کی طرح منہ جما کر پشت اُٹھا کر دُم کے سہارے سے آگے بڑھتا ہے آپ کو بطو خطاب کے ملا ہے۔ آپ کے اس ثقل سماعت نے تو احقر کو بہت ہی

گستاخ کر دیا ہے۔ اب کہاں تک صاف صاف عرض کروں؟ کیڑا اور وہ بھی مٹّی کا نہیں بلکہ مٹّی سے بھی بدتر کسی چیز کا کیڑا آپ کو کہنے لگے ہیں۔ اور پھر کیڑے کا رنگ بھی سُنہری یا روپہلی نہیں بلکہ گہرا کرنجوا مائل بہ سیاہی بتلاتے ہیں ؟"

اژدہا "اچھّا۔ بس بس اب ذکر نہ کیجیے۔ منزل کھوٹی ہوتی ہے"

اور اتنا کہ اژدہا قریب رستہ دیکھتا ہؤا اس زور سے جھپٹا کہ خود تو کیا نظر آتا۔ رہگذر پر کوسوں تک گرد و غبار کی ایک سیدھی دیوار اُٹھی نظر آتی تھی ۔

سرد ویرانوں کے باشندے

اب زلفی کا حال سنئے کہ جب سرد ویرانوں میں بندروں کا قافلہ اُتر لیا۔ تو بندروں کو خیال تک نہ رہا۔ کہ آج اس معصوم بچّے کے پیچھے جنگل کا کوئی شریف خاک چھانتا ہوگا ۔ اُن کے نزدیک اِس سخت مہم کا یہی نتیجہ کافی تھا۔ کہ زلفی وطن سے آوارہ ہو کر اس خرابہ میں آزاد کر دیا جائے اور خود رنگ رلیوں میں مصروف ہو جائیں ۔ زلفی نے آج تک ہندوستان کا کوئی شہر نہیں دیکھا تھا۔ ان ویرانوں پر نظر پڑی۔ تو ہر چیز خوش نما معلوم ہوئی۔ کسی زمانہ میں کوئی بڑا راجہ

تھا۔ جس نے ایک پُرفضا سرسبز پہاڑی پر اس شہر کو آباد کیا تھا + لیکن مدت سے انسان کا وہاں گذر نہ رہا تھا۔ جنگل نے چاروں طرف سے اُس کو گھیر لیا تھا اور خود رو درختوں نے اُس کی شان دار عمارتوں کو چند روزہ حُسن دے کر غارت کرنا شروع کر دیا تھا +

اکثر عالی شان محلوں کے کچھ کچھ حصّے باقی تھے + شہر کے اونچے اونچے دروازے شکستہ حال اب تک موجود۔ اور بُرجیاں اُن پر قائم تھیں + پختہ روشوں کے آثار کہیں کہیں دکھائی دیتے تھے۔ دیواریں جگہ جگہ سے ٹوٹی پڑی تھیں۔ جہاں سے پتھر اُکھڑے تھے۔ وہیں کوئی جنگلی بیل یا خود رو درخت پھوٹ نکلا تھا۔ اور اُس کی ہریاول در و دیوار پر چھائی تھی +

کہیں کہیں کسی شکستہ دیوار کے سایہ اور درختوں کے جُھرمٹ نے مِل جُل کر تنہائی کے گوشے نہایت دلچسپ بنا دئے تھے + شہر پناہ کے کنگورے + اکثر گر گئے تھے اور جو نہیں گرے تھے۔ وہ گرنے کو تھے۔ اور تھوڑی دور پر فصیلوں کے بُرج بھی شق ہو کر آدھے آدھے خندق میں پھسل پڑے تھے + بُرجوں کے ستونوں پر ہری ہری بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ اور دریچیوں میں سے جنگلی درختوں کی شاخیں باہر نکل کر ہر وقت ہوا کے جھونکوں سے جھومتی تھیں +

خندق میں کہیں کہیں برسات کا پانی بھرا تھا۔ اور اُس میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں۔ پیاری جانیں اُچھل اُچھل کر چاندی کے پتّروں کی طرح چمکا کرتی تھیں۔ اور نہائے دھوئے جل کوّے صبح سے شام تک اُن کے فراق میں پانی کے اوپر اوپر ہوا میں پھرکیوں کی طرح پھرا کرتے۔ دس پانچ ڈبکیوں میں دو چار مچھلیوں نے پوٹا بھر دیا تو خوش ہو کر اُڑ جاتے کہ دوسرا پانی دیکھیں ۔

ویرانہ کے بیچوں بیچ پہاڑ کی چوٹی پر راجہ کا محل تھا۔ چھت کبھی کی گر چکی تھی۔ فقط در و دیوار باقی تھے۔ محرابیں موجود تھیں۔ خشک نہر کے کنارے چوپڑ کا فرش اور سنگ مرمر کے فوّارے ٹوٹے پڑے تھے۔ درختوں کی جڑوں نے فرش کے پتھّروں کو توڑ پھوڑ کر ناہموار کر دیا تھا۔ اور سنگ مرمر کی سلوں پر سبز اور سُرخ داغ پڑ گئے تھے ۔

محل کے چبوترے پر مہتابی کے پاس کھڑے ہو کر دیکھو تو چاروں طرف کالی کالی دیواریں دکھائی دیتی تھیں۔ چھت کسی مکان کی باقی نہ رہی تھی۔ پختہ سڑکوں کے کنارے جہاں اب گڑھوں میں پتھّروں کے ڈھیر پڑے ہیں۔ یہ کسی وقت میں بڑے بڑے اندارے اور پن گھٹ تھے۔ یہاں پیاری پیاری لڑکیاں جن کے ہنسنے بولنے کے دن تھے۔ آپس میں چہلیں کرتی پانی بھرا کرتی

تھیں ٭

چبوترہ ہے پر جو ایک بے ڈول سا پتھر کا ٹکڑا پڑا ہے یہ کسی دیوتا کی مورتی تھی۔ جس پر روز صبح سویرے پھولوں کے ہار چڑھا کرتے تھے ٭

وہ ٹوٹا برج جہاں پیپل کے بہت سے چھوٹے بڑے درخت اُگ آئے ہیں۔ جن کے پتے دھوپ میں چمک چمک کر ہوا کے جھونکوں سے تالیاں بجاتے ہیں۔ یہ اس شہر کا عالی شان مندر تھا۔ یہاں صبح شام سنکھ اور گھنٹے بجتے تھے۔ پجاریوں کے میلے لگے رہتے تھے ٭

مگر اب وہ صورتیں کہاں! نہ راج رہا نہ پاٹ۔ بستی کے بسنے اور بسانے والے سب خاک میں مل کر خاک ہو گئے۔ اب تو یہ ایک ویرانہ ہے اور اُس پر بندروں کی حکومت کا ڈنکا۔ کہ رات دن پڑا بجتا ہے ٭

وہ اس شہر کو اپنا شہر مشہور کرتے اور خود شہری بن کر جنگل والوں کو دہقانی بتاتے ہیں۔ مگر آج تک ان مسخروں کی سمجھ میں یہ نہ آیا۔ کہ یہ محل اور مکانات کس نے بنائے تھے۔ اور کیوں بنائے تھے۔ اور ان میں کس طرح رہنا چاہیے۔ مگر زعم یہی تھا۔ کہ ہم ہر بات میں انسان کی نقل اتار سکتے ہیں ٭

راجہ کے محل میں جہاں کبھی درباریوں کا ہجوم رہتا تھا سینکڑوں بندر

ایک کے پیچھے ایک بیٹھ جاتا۔ اور بجائے اس کے کہ رموز سلطنت پر سرگوشیاں ہوں۔ ایک کی جوئیں ایک دیکھ دیکھ کر کھاتا تھا۔ اور اس شغل میں اس درجہ محو ہوتے کہ تھوڑی دیر میں سب کا جی گھبرا اُٹھتا۔ اور فوراً آنکھ مچولی شروع ہو جاتی۔

بیس بیس تیس تیس بندروں کی ٹولیاں بندھ کر اِدھر گھُس اُدھر بیٹھ شروع ہو جاتی۔ دس بندر دالان میں گھس کمانچے میں آئے ہیں۔ تو پانچ کمانچے سے اُچک شہ نشین پر پہنچے۔ ایک جوڑا چھجّے پر سے کود صحنچی کے طاق میں سر دی کھاتا۔ تو دوسرا زینہ سے چڑھ سراپردہ سے برآمد ہو تخت پر ناچ دکھاتا۔ اور اُس غریب بوڑھے بندر کو چھیڑتا۔ جو سائبان کے قلابے میں تن تنہا لٹکا کچّے گولروں کی یاد میں مصروف ہے۔ غرض دس دس کے پیچھے بیس بیس اور بیس بیس کے پیچھے تیس تیس بندر تھے۔ کہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بھاگ رہے ہیں۔

کبھی کبھی بہت اہتمام سے چونے کے ٹکڑے دیواروں سے اُکھیڑ کر صدر کی جانب دیوان خاص کے گوشہ میں۔ جمع کئے جاتے ہیں۔ کبھی صحن چبوترے کی اینٹیں نکال نکال کر اُن کے ڈھیر سنگ مرمر کے تخت پر چنے جاتے ہیں۔ اور پھر اِس کثرت کار میں قوت حافظ یک لخت معطل ہو جاتی ہے اور یہ بھول کر کہ چونے اور اینٹوں کے

خزانے کہاں جمع کئے تھے۔ تفتیش شروع ہوتی اور دوران تفتیش میں خفیف سی رنجشیں پیدا ہو کر دفعتہً اس زور کی لڑائی ٹھنتی۔ کہ سینکڑوں بندر لہو لہان ہو جاتے۔ اور بندریاں بچوں کو کلیجے سے لگا دور جا بیٹھتیں ؛

پھر کوئی خیال یکایک ایسا پیدا ہوتا۔ کہ تیس تیس چالیس چالیس بندروں کی گروہ بندی ہو جاتی اور سب کے سب پائیں باغ میں جا کودتے۔ جہاں ابھی تک پھولوں اور میووں کے درخت خودرو حالت میں پھولا پھلا کرتے تھے ؛

ایک غول رنگتروں میں سے نکل کر ناشپاتیوں میں پہنچا تو دوسرا امرودوں سے نکل کھجوروں کے جھنڈ میں جا کودا۔ ایک نے چمن کی روش پر گلاب کے تختوں کو روند مارا تو دوسرا محض گھاس پر لوٹنے لگا + درختوں کو ہلا ہلا کر پھلوں۔ کی بوچھاڑ پر ہنسیاں ہو رہی ہیں۔ اور پھولوں کے ستھراؤ پر قہقہے لگ رہے ہیں ؛

باغ و چمن تو خیر اپنی جائداد تھے محلوں میں بھی کوئی تہ خانہ۔ کوئی بھول بھلیاں۔ کوئی تاریک سُرنگ کا رستہ ایسا نہ تھا جس کو اُنھوں نے بار بار تحقیق نہ فرمایا ہو۔ لیکن خاک یاد نہ رہتا تھا۔ کہ کون سی چیزیں دیکھ چکے ہیں۔ اور کون سی دیکھنی باقی ہیں ؛

اور پھر دو دو چار چار مل کر گردن میں باہیں ڈالے۔ محلوں میں

ٹہلتے پھرتے اور فخر کرتے۔ کہ جس طرح آدمی یہاں آباد تھے۔ اور اپنے کاروبار میں مصروف رہتے تھے۔ اسی طرح ہم بھی اس شہر میں آباد ہوئے ہیں+ پختہ تالابوں اور سنگ مرمر کے پاکیزہ حوضوں سے پانی پیتے۔ اور تھوڑی دیر میں نرمل جل کو گندا کر کے کیچڑ کر دیتے۔ اور پھر پانی پر لڑائیاں ہوتیں۔ جو خشکی کی لڑائیوں سے ہرگز کم نہ تھیں ؞

اور ابھی ان لڑائیوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا تھا کہ اپنی تعریفوں کے گیت شروع ہو جاتے+ قصیدہ پر قصیدہ پڑھا جاتا۔ کلام میں اس بلا کی شورش ہوتی تھی کہ چیختے چیختے آوازیں بیٹھ جاتی۔ اور ممدوحین کی چندیاں مداحین کے پنجوں کی داد دیتے دیتے گنجی ہو جاتی تھیں اور پھر بھی سب حرکتیں اور اُن کے متعلق مضامین از سر نو شروع ہو جاتے۔ یہاں تک کہ اس شہر کے ٹوٹے محلوں اور اُجڑے باغوں سے بیزار ہو کر پیڑوں پر چڑھ سب کے سب جنگل کو نکل جاتے ور دل میں ارمان ہوتا تھا کہ جنگل والے ہم کو کچھ سمجھنے لگیں ؞

آزاد قیدی

زلفی جس کی حیوانی و جسمانی تعلیم صحرا کے سخت قوانین کے مطابق

ہونی تھی۔ وہ ایسی نامعقول زندگی کو کب پسند کرسکتا تھا ؟ اس
ویرانہ میں آئے ہوئے پورا ایک پہر ہونے کو آیا تھا۔ منزل بھی بہت
سخت طے کی تھی۔ مگر کسی بندر نے نہ آرام کیا نہ زلفی کو تھوڑی دیر
سونے دیا۔ آتے ہی سب نے ناچ رنگ شروع کر دئے۔ ارباب نشاط
کی کیا کمی تھی۔ طائفہ پر طائفہ کھڑا ہو کر اس غضب کی دھر پتیں اڑانے
لگا۔ کہ حال کا پتہ چلتا تھا نہ قال کا۔ غل تھا۔ اور بھورے بھورے
بندر تھے۔ کہ ایک کا ہاتھ ایک کی دم چاروں طرف اچھل رہے تھے"
اتنے میں ایک صاحب کی جو کم بختی آئی۔ دو پاؤں پر کھڑے
ہو ادھر ادھر منڈیا پھیر۔ دیدے جھپکا۔ اسپیچ کہنے لگے "اے بھورے
بال والی بیگمو۔ اور اے لال منہ والے سردارو! زلفی کی گرفتاری ہماری
قدیم تاریخ میں ایک نیا عہد شروع کرتی ہے + آپ کو علم ہوگا۔ کہ یہ
آدمی کا بچہ آج کس محنت اور کوشش سے گرفتار ہوا ہے لیکن افسوس
ہے۔ کہ تہذیب و ترقی تو درکنار۔ بندروں کو اپنی آسایش و آرام کا
خیال بھی نہیں! اس فخر سے کیا ہوتا ہے۔ کہ ہماری قوم اب تک
حیوانات عالم کی بعض قوموں میں سب کی مورث اعلےٰ مانی جاتی ہے۔
کوئی ہنر سیکھ کر دکھاؤ تو جانیں۔ ورنہ سلام ہے آپ کی اس بزرگی
اور قدامت کو + یہ بچہ انسان ہے۔ اور انسان کو کیا نہیں آتا؟ کیا عجب
عجب ہے۔ کہ اس وقت ہم ہی میں کوئی بڑا بوڑھا بندر ایسا بھی موجود

د۔ جس کی کمر پر بندر والے کی رسی کا نشان اور جس کے کانوں میں اب
لک ڈگڈگی کی صدائیں گونج رہی ہوں + بہتر ہے کہ وہ اُٹھے اور بتائے
۔ وہ کون سے ہنر ہیں جو انسان کو نہیں آتے ؟"
زلفی نے اتنی ہی تقریر سُنی تھی۔ کہ ڈر کر موٹی موٹی گھاس کے
بس پانچ پتھے توڑ لئے اور اُن میں جلدی جلدی انگلیاں چلانے لگا
یسے کوئی بوریے والا بوریہ بنتا ہو ؛
بندروں پر کچھ تو تقریر کا اثر ہوُا۔ اور کچھ اس نئے کھیل کو
یکھ کر سب کے سب زلفی کی نقل اُتارنے لگے + مگر کب تک ؟
تھوڑی ہی دیر میں گھبرا گئے اور سب کو یک لخت اس زور کا خفقان
چھلا۔ کہ ایک بندر نے دوسرے بندر کی دُم پکڑ کر بے اختیار کھانا
شروع کر دیا۔ اور جن صاحب نے تقریر کی تھی اُن کی تو وہ بُری
لت ہوئی۔ کہ اگر کبھی ملاقات ہو۔ تو بس اُن ہی سے پوچھئے گا ؛
بھوک کے مارے زلفی کی جان نکلی جاتی تھی۔ جب بالکل ضبط
نہ ہوسکا۔ تو دو چار بندروں سے اُس نے کہا۔ کہ میں بھوکا ہوں۔
یا تو خود کھانے کو دیجئے۔ یا شکار کی اجازت ملے کہ زمین آپ کی ہے۔
اور میں پردیسی ؛
اتنا سنتے ہی جوش مہمان نوازی سے بے تاب ہو تیس چالیس بندر
دیواریں پھاند باغوں میں جا کودے۔ اور کچے پھلوں کی بھری ڈالیاں

توڑ کر گھسیٹتے ہوئے لاتے تھے۔ کہ رستے میں لڑائی ہو پڑی۔ اور اِس زور کی ہوئی۔ کہ اُس کے بعد پھلوں کو سمیٹ کر زلفی تک پہنچانا بندروں کے بس کی بات نہ رہی ٭

زلفی سخت پریشان تھا۔ بدن پر بیسیوں نیل پڑے ہوئے نیند کے مارے بُرا حال اور بھوک کے ساتھ غصّہ بڑھتا جاتا تھا۔ شہر کے ویران گلی کوچوں میں پڑا پھرتا۔ شکار کے لئے پردیسی کی صدا لگاتا۔ مگر کہیں سے جواب نہ ملتا۔ اب اُس کی سمجھ میں آیا۔ کہ اس سے بدتر جگہ جنگل میں کہیں نہ ہوگی۔ اُستاد نے جو کچھ فرمایا تھا۔ وہ سب سچ نکلا۔ "یہ بندر حقیقت میں بڑے ہی نالائق۔ ناہنجار ہیں۔ اُن کے ہاں نہ کوئی برادری کا قانون ہے۔ نہ شکار کا دستور العمل۔ اور پھر اس جگہ کا کوئی چودھری نہیں۔ کہ جس سے فریاد کیجیے + زبان رکھتے ہیں محض چیخنے کے لئے اور ہاتھ ہیں جن کی انگلیوں نے سوائے چوری کرنے اور چٹکیاں لینے کے کوئی ہنر نہیں سیکھا + اگر میں یہاں بھوکا مر گیا۔ یا کسی جانور نے مار ڈالا۔ تو کسی کا قصور نہیں۔ اپنی ہی خطا ہے + کیا کروں جو جنگل میں پھر پہنچ جاؤں؟ موقع ملے تو بلا سے بھاگ ہی جاؤں۔ بھالو پیٹیں گے تو بہت۔ مگر ان بندروں کے ساتھ کب تک بیٹھا گل گُترا کروں گا"٭

یہ سوچ آنکھ بچا زلفی فصیل کی طرف چلا + دیوار پر چڑھ گیا تھا کہ

بندروں نے دیکھ لیا اور دوڑ کر پکڑ لائے۔ اور سمجھانے لگے کہ بے وقوف تجھ کو اب تک اپنے برے بھلے میں تمیز کرنی نہ آئی؟ دیکھ تو یہاں کیسا خوش ہے۔ کس حال سے کس درجہ تک ہم نے تجھ کو پہنچایا۔ پھر بھی ہمارا احسان نہیں مانتا + زلفی کچھ بولنے کو ہوا۔ لیکن بندروں نے اس خیال سے کہ آیندہ یہ لڑکا اپنے کسی محسن کا احسان نہ بھولے اُس کے چٹکیاں لینی شروع کردیں + زلفی زبان سے کچھ نہ بولا مگر غصہ سے دانت پیستا تھا۔ کہ اتنے میں دو چار موٹے موٹے بندروں نے اُس کو پکڑ لیا۔ اور گھسیٹتے ہوئے تال کی طرف لے گئے +

یہ تال بھی اس ویرانہ میں عجیب منظر تھا + محل کے ایک طرف اُونچا بند باندھ کر بیچ میں بڑا تالاب بنایا تھا۔ چاروں طرف سنگ سُرخ کی سیڑھیاں تھیں اور چوڑے بند پر پتھروں کا فرش۔ پاکیزہ چشموں اور آبدار نہروں کا پانی تو اب اس تال میں کہاں سے آتا۔ برسات کا پانی البتہ نشیب میں کچھ بھرا رہتا تھا + باقی حصہ جو خشک پڑا تھا۔ اُس میں موٹی موٹی گھاس اور نرسل کھڑے ہو گئے تھے۔ اور تال کے بیچ میں سنگ مرمر کی ایک بارہ دری تھی۔ جس میں رانیاں اور راج کماریاں جھروکوں میں بیٹھ کر تال کی سیر کیا کرتی تھیں +

اوپر کا بُرج شق ہو گیا تھا۔ اور اُس کا آدھا ٹکڑا اندر آ پڑا تھا۔ اور اُس کے ملبہ سے وہ سُرنگ کا رستہ جو تال کے نیچے نیچے محل سے

بارہ دری میں آنے کا تھا۔ بالکل اٹ گیا تھا + چاروں طرف خوبصورت ستونوں اور محرابوں میں سنگ مرمر کی جالیاں قنانوں کی طرح لگی تھیں + جالیوں کو چھوڑ کر درو دیوار پر پچی کاری کا کام تھا۔ ہر پھول میں عقیق ویشب اور ہر پتے میں سبزے اور فیروزے جڑے تھے۔ جالیوں کو دیکھئے تو سنگ تراش کے ہنرمند ہاتھوں نے ایک سحر کیا تھا۔ سخت پتھر کو تراش کر پھول پتوں کی نوک پلک ایسی نزاکت سے نکالی تھی۔ کہ جس وقت مہتاب نے پہاڑ کے دامن سے بلند ہو کر اُن جالیوں پر اپنی روشنی ڈالی۔ تو تاریک فرش پر اُس کا عکس ایسا پڑا۔ جیسے کسی نے سیاہ کاشانی مخمل پر کافوری ریشم کا کارچوبی کام کیا ہو +

زلفی ایسا خستہ حال ہو رہا تھا۔ کہ ہنسنے بولنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ مگر بندروں کے افعال واقوال دونو ایسے ناشایستہ اور عجیب تھے۔ کہ بے اختیار ہنسی آجاتی تھی +

زلفی جوں ہی تال کے کنارے پہنچا۔ بندر بھی وہاں آنے شروع ہو گئے۔ اور اب سب نے مل کر اُس کو نصیحتیں کرنی شروع کیں + بہت سے بندر حلقہ باندھ کر اُس کے گرد کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے "سنو۔ سنو۔ ہم جنگل میں سب کے اُستاد ہیں۔ طبیعتیں آزاد ہیں۔ مزاج بے تکلف ہیں۔ چست ہیں۔ چالاک ہیں۔ دماغوں میں فطانت ہے۔ حواسوں میں تیزی۔ دیدے گول ہیں۔ دُمیں شربر ہیں۔ جنگل میں ہم سے بڑھ کر کوئی

چنچل نہیں۔ ہم غیرت صحرا و رشک جبل ہیں اور اپنی نسبت ہم سب کا یہ
ہی خیال ہے۔ اور اس لئے ہمارا خیال صحیح ہے۔ پس تم کو چاہیئے۔ کہ ہماری
خو بو۔ رگ و پے عادات و خصائل سے آگاہ ہو جاؤ۔ تاکہ جنگل میں ہماری
تعریف کر سکو۔ اور جنگل کے رہنے والے ہماری عزت کرنے کو اپنا فخر
سمجھنے لگیں۔"

زلفی کو سوائے ہاں ہاں کرنے کے چارہ ہی کیا تھا؟ بندروں کا
اژدہام بڑھتا جاتا تھا۔ اکائیاں۔ دہائیاں۔ سینکڑے کب کے ختم
ہو گئے تھے۔ اب تو ہزاروں اور لاکھوں پر نوبت تھی۔ قافلہ بر
قافلہ اور کارواں بر کارواں تھا۔ کہ چلا آتا تھا۔ تال کی سیڑھیوں
پر پختہ گھاٹوں کے اونچے چبوتروں پر ہزاروں کا گیت گا رہا
تھا۔ اگر چیختے چیختے کسی کا دم ٹوٹ جاتا تھا۔ تو سامعین اس وقفہ کو
اپنے گلو خراش نعروں سے پر کر دیتے تھے۔ اور اس شور بے ہنگام کا
سلسلہ کہیں ختم نہ ہوتا تھا۔

زلفی اِس غل کو سُن سُن کر گھبرایا جاتا تھا۔ اور دل میں کہتا تھا ہو
نہ ہو کسی باؤلے گیدڑ نے اِن بندروں کو کاٹ کھایا ہے۔ کیا عجب
ہے کہ میاں طباقی وارفتہ مزاج ہو کر اس راہ سے گزرے ہوں۔
اور اس وقت ان بندروں کو ہڑک اُٹھی ہو۔ دیکھیے رات کو بھی
سوتے ہیں۔ یا یوں ہی رات جگا رہتا ہے۔ اہا ہا ہا۔ یہ آسمان پر

بادل کا ٹکڑا کیسا آیا۔ اور دیکھو چاند کی طرف کیسا پھُر پھُر اُڑا چلا آتا ہے۔ ایک ذرا اَور بڑا ہوتا تو اندھیرا ہوتے ہی یہاں سے نکل جاتا۔ لیکن ہاتھ پاؤں تو چُور ہو رہے ہیں۔ بھاگا کِس سے جائیگا؟

بگھیرے کا دھاوا

اور اِسی بادل کے ٹکڑے کو زلفی کے دو دوست شہر پناہ کے سایہ میں کھڑے خندق سے دیکھ رہے تھے۔ کہ کب چاند اُس میں چھُپے اور وہ شہر میں داخل ہوں۔ اژدہے کے ساتھ بگھیرے کی ہمت بھی نہیں پڑتی تھی۔ کہ بندروں کی ایسی بے شمار جمعیت پر یوں ہی بے سوچے سمجھے حملہ کر بیٹھیں۔ جنگل کے شکاری جانور بندروں کا حال خوب جانتے تھے۔ اور بندروں کا بھی یہ اُصول تھا کہ جب تک ایک دشمن کے مقابلہ میں سو نہ جمع ہو جائیں۔ مقابلہ نہ کرتے۔ پھر ایسے بہادروں کو جنگل میں کون پوچھتا؟

اژدہا دیوار کے نیچے نیچے دُور تک پھیلا پڑا تھا کہ پھن اُٹھا کر بگھیرے سے بولا "لیجئے بندۂ درگاہ تو رخصت۔ شہر پناہ کے دوسری طرف کچھ حصّہ دیوار کا میرے چڑھنے کے قابل ہے۔ اور اُس نے وقت وقت ایسی ڈھلوان زمین مِل جائے گی۔ کہ چُپ چاپ موقع پر پہنچ

جاؤں گا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ اور خبر ہوئی بھی۔ تو بندر میری پیٹھ پر کود کر کان کاٹنے سے تو رہے۔ البتہ آپ کو کسی قدر۔۔"
بگھیرا "جی ہاں۔ میں سمجھا۔ پشت و شکم کا مضمون تو اس وقت خارج از بحث ہے۔ کمزوروں سے زور آزمائی اپنا شیوہ بھی نہیں۔ مگر کچھ ایسی ہی بات آپڑی ہے۔ بھالو بھی اس وقت ساتھ ہوتا تو بہتر تھا + خیر وہ ہو یا نہ ہو۔ ذرا یہ بادل کا ٹکڑا چاند پر آجائے۔ تو بندہ آپ سے پہلے جان کھونے کو مستعد ہے + معلوم ہوتا ہے تال کے کنارے مشورے ہو رہے ہیں۔ غل تو دیکھئے کس بلا کا ہے"

اژدہے نے پوری بات بھی نہ سنی۔ اور کھسکنا شروع کر دیا۔ اور شہر پناہ کی دوسری طرف پہنچ پتھروں کو دیکھتا بھالتا دیوار پر چڑھنے لگا + اس عرصہ میں بادل کا ٹکڑا چاند پر آگیا۔ اور زلفی دل میں کہنے لگا کہ دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے کہ پتھروں پر پنجوں کی آہٹ سنی۔ فوراً سمجھ گیا کہ بگھیرا کمک کو آیا ہے +

چاند کے چھپتے ہی بگھیرا ٹوٹی فصیل پھاند کر دوڑتا ہوا اس صفائی سے گھاٹ پر پہنچا۔ کہ دم تک نہ ٹوٹا + کاٹنے اور نوچنے میں اوقات ضائع کرنی تو بگھیرے کو آتی نہ تھی۔ دشمن پر پہنچتے ہی زلفی کے گرد بندروں کے دَل بادل میں پنجے اور ناخن سے خنجر و شمشیر کا کام لینے لگا + کوئی چنگل ایسا نہ تھا کہ طمانچہ نہ چلاتا ہو اور کوئی ناخن نہ تھا۔ کہ ایک اشارہ میں

دو چار بندروں کی روح نہ کھینچ لیتا ہو۔ شور پر ایک اور شور خوف و عتاب کا پیدا نہ ہوا تھا۔ کہ سینکڑوں بندر زخمی ہو کر خاک پر پڑے ہاتھ پاؤں پیٹنے لگے۔ اور بگھیرا بندروں کی روئی سی دھنکتا لاشوں کو روندتا کچلتا آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ کہ ایک نے للکار کر کہا "یارو۔ کیوں جانیں مفت میں کھوتے ہو۔ دشمن فقط ایک ہے اور ہم لاکھوں"۔

اس للکار کے سنتے ہی اُتر کے گھاٹوں سے بندروں کی ایک بلا خیز موج تڑپتی اور لوٹتی۔ سمٹتی اور بکھرتی ایسی تیرہ و تار آئی۔ کہ بگھیرا بندروں کے اس گرداب میں چھپ کر نظر سے غائب ہو گیا۔ اور دس بارہ بندر دوڑتے ہوئے زلفی کی طرف آئے۔ اور اُس کو پکڑ کر کسی رستہ سے تال کے بیچ بارہ دری کے برج پر لے چڑھے۔ اور جہاں سے برج ٹوٹ گیا تھا وہاں سے زلفی کو دھکا دے بارہ دری کے اندر گرا دیا۔ زلفی نے اگر آدمیوں میں پرورش پائی ہوتی تو پانچ چھ گز کی بلندی سے گر کر ہڈیاں چکنا چور ہو جاتیں لیکن جنگل کا تعلیم یافتہ تھا۔ جس طرح بھالو نے گرنا سکھایا تھا اُسی طرح پنجوں کے بل زمین پر آیا۔

اور بندروں نے چلّا کر کہا "بس آدمی کے بچے اسی جالیوں کے پنجرے میں بند پڑا رہ۔ اگر کالے کوڑ یالوں نے جینا چھوڑ دیا۔ تو تیرے حمایتی کا خون پی کر دیکھ تیری بھی کیسی خبر لیتے ہیں۔ بوٹیاں

سوکے قبضہ نہ بنایا ہو۔ تو بندر نام نہیں "

زلفی کے قدم زمین تک پہنچے ہی تھے۔ کہ ہر کالے موکھے میں سے ایک کوڑیالا اور ہر پتھر کے نیچے سے ایک افعی کا بچہ پھنکارے مارتا نکل آیا۔ زلفی نے فوراً سانپ کا منتر پڑھا۔ اور کہا "یارو میں دوست ہوں دشمن نہیں۔ مدت سے بن باس ہو کر بھیڑیوں کا بھائی بنا ہوں" اتنی بات کہتے کہتے صدہا ناگ زلفی کے گرد پھن پھیلا پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ زلفی نے ڈر کے مارے پھر منتر پڑھا اور سانپوں سے پناہ مانگنے کے لئے پردیسی کی صدا لگائی۔

صدا کے سنتے ہی کالے کوڑیالوں کا سردار للکار کر پھنکارا "جوانو پھن سمیٹ کر فوراً منڈیاں زمین پر ڈال دو۔ اور اُلٹے شکم موکھوں میں چھپ جاؤ۔ اور اے جنگل کے مسافر سن لے کہ جہاں کھڑا ہے اسی طرح کھڑا رہ کہ ہم تیرے پاؤں میں کچل نہ جاویں "

زلفی جہاں کھڑا تھا۔ وہیں دم سادھے کھڑا رہا۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جالیوں میں سے دیکھتا تھا۔ کہ اس گھمسان میں کہیں بگھیرے کا پتا بھی چلتا ہے یا نہیں۔ کہ اتنے میں بندر روئی کے گالوں کی طرح چاروں طرف اُڑتے نظر آئے۔ اور بگھیرا دشمنوں سے لڑتا بھڑتا۔ آگے بڑھتا۔ پیچھے ہٹتا۔ دولتیاں جھاڑتا۔ پنجہ و ناخن سے دشمن کے پرخچے اُڑاتا۔ گردنیں چبا چبا کر دائیں بائیں لاشوں کو

پھینکنا بندروں کے غبار میں سے کچھ کچھ دکھائی دیا + زخمیوں کی چیخیں۔ مردوں کا ماتم۔ زندوں کی بھپکیاں اور کچکچیاں۔ ایک شور تھا۔ کہ زلفی کے کان پھٹے جاتے تھے + ہزاروں گلے تھے۔ کہ چیختے چیختے بیٹھ گئے تھے۔ اور بتیسیاں تھیں۔ کہ دانت پیستے پیستے گھس چلی تھیں۔ اور یہ جنگل کا پہلا معرکہ تھا۔ کہ نسل پلنگ کا ایک شریف زادہ اور وہ بھی مادرزاد کالے رنگ کا بگھیرا ایک ذلیل دشمن کی بے شمار جمعیت سے شوق شکار میں نہیں بلکہ محض اپنی جان بچانے کے لئے جنگل میں لڑا ہو +

زلفی نے بگھیرے کو دیکھتے ہی دل میں سوچا کہ بگھیرا اکیلا نہیں آیا ہے بھالو بھی ضرور کہیں آس پاس ہوگا۔ یہ سوچتے ہی زلفی نے جالیوں کے پاس منہ لاکر بگھیرے کو آواز دی کہ "بگھیرے بگھیرے جس طرح ہو پانی کے پاس پہنچ کر غوطہ لگالو۔ پھر دشمن کچھ نہ کر سکیگا" +

زلفی کی آواز بگھیرے نے سنی۔ اور سنتے ہی اُس کی ہمت دوچند ہوگئی اور اب بگھیرے نے پانی کی طرف بڑھنا شروع کیا + بندروں نے روکنا چاہا۔ اور ایک ایک قدم پر بیسیوں اپنی جانیں فدا کرنے لگے۔ لیکن بگھیرا برابر سیڑھیاں اُتر رہا کہ سمت صحرا کی دیوار سے کالے سے کمبل کا ایک دقیانوسی جھنڈا بلند ہوا۔ اور بھالو کا نعرہ جنگ جیسے اونچے پیڑ میں کھٹکھٹا بندھا ہو سب کے کانوں تک پہنچا +

زلفی سنتے ہی اُچھل پڑا کہ اُستاد آن پہنچا۔ اب فتح میں کس کو کلام ہے ❊

کمک

اس ضعیفی میں بھالو بیچارے کو ایسی مصیبت کب اُٹھانی پڑی تھی! اپنی بساط سے زیادہ تیز چلا۔ پھر بھی اتنی دیر میں پہنچا کہ بگھیرا لڑتے لڑتے گھبرا گیا تھا۔ اور اب شہر پناہ کی منڈیر سے بھالو للکارے۔

"بھیّا بگھیرے۔ خبردار جی نہ چھوڑیو۔ میں آن پہنچا ہوں۔ دیکھ یہ دیوار پر چڑھا۔ اور یہ نیچے دھم سے کودا۔ اور اب تیرے پاس پہنچا۔ دل پر ذرا میل نہ لائیو۔ ایک میرا ذرا انتظار اَور کر لے۔ اے بندرو۔ بے ایمانو۔ تم کس دن جنگل سے غارت ہو گے!!

اس آواز کے چپ ہوتے ہی دیوار سے وہ جھنڈا بھی غائب ہو گیا۔ اور گھاٹ پر ریچھ کی منڈیا اُبھری ہی تھی۔ کہ بندروں کا ایک بگولا اُٹھا۔ اور بھالو جنگل کا گرو اس میں غائب ہو گیا۔ مگر بھالو نے بھی عمر بھر لونڈے پیٹے تھے۔ جھٹ پُٹھوں کے بل بیٹھ دم کے سہارے سے چکر کاٹنے لگے۔ اور دونو پنجوں سے بندروں کو بھوسی کی طرح چھاج میں پھٹکنا شروع کر دیا۔ کہ اتنے میں پانی میں کوئی چیز دھم سے گری۔ اور چھینٹوں کے اُڑنے کی آواز ہوتے ہی زلفی سمجھ گیا۔

کہ بگھیرا دشمن سے رستہ نکال کر پانی میں پہنچ گیا۔
بگھیرے نے نال میں اترتے ہی سارا بدن پانی میں چھپا لیا۔ فقط منہ باہر نکلا رہنے دیا۔ اور زور زور سے ہانپنے لگا۔ اس عرصہ میں سینکڑوں بندر گھاٹ کی سیڑھیوں پر صف بستہ ہو گئے اور بالکل تیار تھے۔ کہ اگر ریچھ کی مدد کے لئے بگھیرا پانی سے نکلے۔ تو نکلتے ہی اُس کا کام تمام کر دیں۔ اور یہ وقت وہ تھا۔ کہ بگھیرے نے ٹھوڑی تک منہ نکال کر جس سے خون اور پانی کی بوندیں ٹپ ٹپ ٹپک رہی تھیں۔ اژدہے کو آواز دی۔ اور جب جواب نہ ملا۔ تو سمجھ گیا۔ کہ آج اس لمبے لہری نے عین وقت پر دھوکا دیا۔ آخر کار مجبور ہو کر پانی کے سانپوں سے پناہ مانگنے کے لئے صدا لگائی۔
بندروں کا وہ ہجوم تھا۔ کہ بھالو کو دم لینے کی مہلت نہ تھی۔ لیکن بگھیرے کی صدا کان میں پڑتے ہی دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ اور کہنے لگا۔ "سچ ہے۔ بڑے بول کا سر نیچا۔ یہ وہ ہی بگھیرا ہے جس کو اپنے پنجہ و ناخن پر ناز تھا۔ آج ایسا معذور ہو گیا۔ کہ مٹی چاٹ کر خاک پر لوٹنے والوں سے پناہ مانگ رہا ہے"۔
اب بابا جی اجگر کا حال سُنئے کہ سیدھی دیوار پر پتھروں کی درزیں پکڑتے ہوئے لہریا کاٹتے مشکل سے مُنڈیر تک پہنچے اور ممٹی کے پتھر

میں دُم اٹکا کر دوسری طرف اُترنے شروع ہوئے۔ مگر نک زمین پر پہنچے تھے کہ ہلکا سا جھٹکا دیکر پنجہ سے دُم چھڑائی مگر وہ ہلکا سا جھٹکا بھی اس غضب کا تھا کہ منڈیر کا پتھر باہر کی طرف خندق میں گر کر دو ٹکڑے ہو گیا۔

جب زمین پر پورے تیس فٹ اُتر لیے۔ تو دیر تک کُنڈلیاں مار مار کر تہ ہوتے اور کھُلتے رہے۔ اور گردن سے لے کر دُم تک ایک ایک جوڑ کو جانچ لیا۔ کہ زنجیر کی کوئی کڑی کسی کانٹے سے تو نکل نہیں گئی۔ کہ عین وقت پر دھوکا نہ دے جائیے۔

جب بالکل اطمینان ہو گیا۔ کہ پھن سے لے کر پورے نو گز سولہ گرہ تک جہاں دُم کے ساتھ خود بھی ختم ہوتے تھے۔ کیل کانٹے سے درست ہیں۔ تو اب یہ تردد پیدا ہوا۔ کہ بندر اگرچہ ایک حقیر دشمن ہے۔ لیکن پھر دشمن ہے۔ لڑائی کا موقع ہے۔ کہیں کسی بات میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ اور اس سوچ بچار میں اژدہے نے بہت سا وقت ضایع کیا۔

لڑائی کا حال اس وقت بہت نازک تھا۔ اِدھر تال کی سیڑھیوں پر بندر بکھیرے کے مقابلہ میں تُلے کھڑے تھے۔ اُدھر گھاٹ پر بھالو کی دھجیاں اُڑ رہی تھیں۔ غرض ہر طرف ہنگامہ کارزار ایسا گرم تھا۔ کہ شپرّ کور نے طایران شب بیدار کے ایلچی وطن کو دوڑائے۔ اور جنگل میں لڑائی کی خبر ایسی گرم ہوئی۔ کہ گجپال ہاتھی نے بھی پہاڑ

کی تلہٹی سے سنکھ پھونکا۔ اور بندروں کی منتشر فوجیں جو دو دو چار چار کوس پر پڑاؤ ڈالے پڑی تھیں۔ ہوشیار ہو کر پیڑوں پیڑوں منزل پر منزل مارتی دوستوں کی کمک کو چل پڑیں۔ اور لڑائی کے شور نے صحرا کے پرندوں کو جو درختوں کی ڈالیوں میں بیٹھے بسیرا لیتے تھے۔ گہری نیند سے جگا دیا۔ اور وہ دیس میں بیٹھے پر دیس کی لڑائیوں کے چرچے سُن سُن کر چیں چیں کرنے لگے ⁂

اور اب وہ وقت آیا کہ اژدہا بھی میدان میں آئے۔ شہر پناہ سے گھاٹ کی شست باندھ کر ایسا چلا۔ جیسے کڑی کمان کا تیر۔ سیدھا۔ تیز اور دشمن کی ہلاکت پر آمادہ ⁂

اجگر کی پھنکار

شکار کے وقت تو اژدہا شکار پر لپٹ کر بدن کے جوڑوں سے کام لیتا ہے۔ لیکن لڑائی کے وقت اُس کے حملہ کا طریق اَور ہے۔ چار پانچ ہاتھ سیدھا برچھے یا بلّم کی طرح تُل کر جسم کی پوری طاقت اور وزن سے دشمن کے ہُولا لگاتا ہے۔ یا کمر تک کنڈلی مار کر باقی جسم سے دشمن کو کوٹ ڈالتا ہے۔ اُس کے حملہ کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ یا تو ایک لوہے کا ہتھوڑا وزن میں تیس چالیس من کا ہو۔ اور اُس کی

دستگی میں سلامتی عقل و حواس کے ساتھ مثل ایک ذی روح کے
ضرب لگانے کی قوت موجود ہو۔ اور یہ ضربیں کسی خاص نشانہ پر
لگاتار پڑتی ہوں۔ معاذ اللہ! یا پُرانے زمانہ کا کوئی قلعہ شکن منجنیق ہو
کہ لوہے کا ایک بہت وزنی شہتیر ہوتا تھا۔ جس کی ٹکر سے قلعہ کی
دیواریں توڑ دی جاتی تھیں ؛

اس کہانی کا اژدہا تو پورے دس گز کا تھا۔ اگر اژدہے کا بچّہ
بھی گز ڈیڑھ گز کا پورے قد کے آدمی کے سینہ پر منہ مارے۔ تو آدمی
چاروں خانے چت زمین پر جا پڑے۔ اور سانس نہ لے ؛

اژدہے نے گھاٹ پر پہنچتے ہی پہلا سانٹا اُس غول پر مارا جو
بھالو کو نوچ کھسوٹ رہا تھا + اس کے بعد پھر تکلیف کرنے کی
ضرورت نہیں ہوئی۔ اژدہے کو دیکھتے ہی ہزاروں بندر یک لخت
چلا اُٹھے "بھاگو بھاگو۔ اژدہا آگیا"! اور بھالو پر سے بندر ایسے
پھٹے۔ جیسے پانی پر سے کائی ؛

پشت ہا پشت سے بندروں نے اژدہے کے ستم کی کہانیاں
سُن کر اپنے اخلاق و آداب کی اصلاح کی تھی۔ اژدہا اُن کے حق
میں موت کے فرشتے سے کم نہ تھا۔ جب سے جنگل قایم تھا۔ بندروں
کو پکڑ کر نہایت شوق اور اہتمام سے کھاتا چلا آیا تھا۔ درختوں کا ہادی
چور تھا۔ جو ڈالوں پر اس طرح چڑھ جاتا۔ جیسے پتھر پر کائی یا دیوار

پر سایہ۔ اور پھر درخت پر چڑھتے ہی میں صفائی نہ تھی۔ بلکہ بارہا سُننے میں آیا کہ کسی اونچے درخت میں ایک ٹوٹی ہوئی ڈال بے حس و حرکت لٹک رہی ہے۔ اور بڑے بڑے پُرکھا بندر بھی دھوکا کھا کر اُس پر جا کودے۔ اور ڈال اُن کو پکڑ کر سٹک گئی ؛

یہ اور ایسے ہی اور بہت سے چشم دید واقعات بندروں میں اگلے وقتوں سے روایت ہوتے چلے آئے تھے۔ اور کسی بندر کو اس کا علم نہ ہوا۔ کہ اژدہے کی قوت کی کوئی انتہا بھی ہے یا نہیں + اس کے علاوہ اُس کی نظر میں اس بلا کا سحر تھا۔ کہ جہاں بندر پر پڑی۔ اور بندر کی جان آدھی رہ گئی ؛

غرض اژدہے کو دیکھتے ہی ایک دم سے بندروں کی گھگیاں بندھ گئیں۔ اور یا تو ہزاروں بندر پکارتے گلے صاف چلّا رہے تھے۔ یا سب کے سب ہکلاتے ہوئے جان کے خوف سے جدھر منہ اُٹھا بھاگ نکلے ؛

بندروں کی چھیڑ ہوتے ہی بھالو جی کو بھی دم لینے کی فرصت ملی + اگرچہ اُن حضرت کی پوستین بگھیرے کی پوستین سے بہت دبیز تھی لیکن لڑائی میں جیسا بُرا درجہ اس کا ہوا تھا۔ بگھیرے کا نہیں ہوا تھا ؛

بندروں کو بھاگتے دیکھ کر اژدہے نے سر اُٹھا کر زور سے اُلٹا دم کھینچا۔ اور تین فٹ کے نل میں بھاپ بھر کر اس غضب کا پُھنکارا

مارا کہ کوسوں تک بندروں کے منتشر جرگے جو سرد و یرانوں کی طرف
دوستوں کی مدد کے لئے درختوں درختوں دوڑے چلے آتے تھے
جہاں تھے وہیں کے وہیں رہ گئے۔ اور درختوں کی ڈالیاں اُن کے
بوجھ سے ٹوٹنے لگیں ؂

پھُنکارے کی خوفناک آواز کے ساتھ کہیں غل کا نام نہ تھا۔
ایک سناٹا تھا کہ چاروں طرف چھا گیا ؂

زلفی نے جوں ہی جالیوں میں سے دیکھا۔ کہ بگھیرا پانی سے نکل کر
سیڑھیوں پر کھڑا پوستین خشک کرتا ہے۔ بندروں میں پھر ایک دفعہ
غل پڑا۔ نیچی دیواروں سے اُچک اُچک کر اونچی دیواروں پر چڑھنے
لگے۔ کچھ ویران بُت خانوں میں چلے گئے۔ اور بتوں کی گردنوں میں
باہیں ڈال ڈال کر زار و قطار رونے لگے۔ بہت سے فصیلوں پر
چڑھ کنگوروں کنگوروں بھاگنے لگے۔ سیکڑوں بچّے یتیم ہو گئے۔
ہزاروں بندریاں بیوہ ہو گئیں۔ ایسی خوفناک تباہی اس قوم پر پہلے
کبھی نہیں آئی تھی ؂

یہ نظارہ دیکھ کر زلفی نے قہقہے لگائے اور اُلّو کی بولیاں بول کر
خوب خوب چھیڑا۔ اور فتح کی خوشی میں ناچ ناچ کر دیر تک گاتا اور
اور بگھیرے کو مبارک باد دیتا رہا ؂

جب وہ چار جھُرجھُریاں لے کر بگھیرے نے پوستین خشک کر لی

تو سیڑھیاں چڑھ کر اژدہے سے ملاقات کو آیا اور کہنے لگا۔ واقعی آج آپ کو سخت تکلیف ہوئی۔ اب جہاں اس قدر تکلیف گوارا فرمائی ہے تو اُس لڑکے کو بھی قید سے رہا کیجیے۔ جس کے لئے یہ سب کچھ ہؤا ہے مناسب ہے کہ ہم اُس کو لے کر یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ کیونکہ اندیشہ ہے کہ بندر پھر حملہ کریں گے ؛

اژدہا۔ مجال ہے کسی بندر کی کہ دُم تک ہلا سکے۔ خبردار بندرو۔ جہاں ہو وہیں بیٹھے رہو ؛

اتنا کہ اژدہے نے پھر اُلٹا دم کھینچ کر پھنکارا مارا اور تمام ویرانوں میں بندر کی آواز عنقا ہو گئی ؛

اژدہے نے بگھیرے سے معذرت کی۔ کہ "فی الواقع مجھ کو یہاں تک پہنچنے میں کسی قدر عرصہ ہو گیا میں نے آپ کی آواز سنی تھی۔ لیکن ایسا عدیم الفرصت تھا کہ جواب نہ دے سکا۔ مگر مجھے یہ اطمینان تھا۔ کہ آپ کو مدد کی ضرورت تو ہے نہیں۔ ویسے ہی پکارا ہو گا"؛

بگھیرا یہ فقرہ سُن کر جل گیا اور بولا "لڑائی سخت ہو رہی تھی۔ ممکن ہے طلب امداد میں کوئی جملہ بے اختیار زبان سے نکلا ہو۔ وقت پر تو آپ جانتے ہیں۔۔۔۔ خیر یہ ہی سمجھئے کہ اژدہے کو بھی اُستاد ماننا پڑتا ہے۔ اے لیجئے۔ بھالو بھی آ رہے ہیں۔ کہو گرو۔ کہیں چوٹ پھینٹ تو نہیں لگی"؟

بھالو چوٹ پھینٹ تو کیا بتاتے اُن کو سرے سے یہ ہی خبر نہ
تھی۔ کہ جیتے ہیں یا بزرگوں کی ہڑواڑ میں پہنچ لیئے۔ جب گھبیرے
نے پھر پوچھا تو دو چار قدم دوڑ کر پشت و کمر کو بار بار سونگھا۔ اور
بہت کچھ تامل کے بعد بولے "بہت غنیمت سمجھو کہ زندہ ہوں
میں تو سمجھا تھا کہ آج ان نابکار بندروں کے ہاتھوں اس بڑھی
پوستین کے پرخچے اُڑ کر سینکڑوں ریچھ کے بچے پیدا ہو جائیں گے
مگر زندگی تھی جو بچ گیا۔ باباجی کا دم سلامت رہے۔ آج تو ان ہی
کے ہاتھوں جان بچی ہے"

زلفی کی رہائی

اژدہا۔ جان بچانے والا تو کوئی اَور ہی ہے۔ یہ فرمائیے کہ وہ لڑکا
کہاں ہے؟

یہ سُن کر زلفی چلّایا "اِدھر دیکھئے۔ اِدھر! ان جالیوں کے پنجرے
میں۔ باہر نکلنے کا رستہ آپ ہی نکالئے گا تو نکلے گا۔ چاروں طرف
پتھر کی اونچی اونچی جالیاں ہیں اور سر پر آدھا بُرج تلا کھڑا ہے کہ
اب گرا اب گرا"

زلفی نے اتنا کہا ہی تھا کہ بہت سے کوڑیالے پھنکارے مار کر

بولے " بابا جی - بابا جی اس لڑکے کو یہاں سے نکالیئے - مور کی طرح ناچ رہا ہے - کسی آن نچلا نہیں رہتا - ہمارے انڈے بچے سب کچلے ڈالتا ہے "

بابا جی ہنسکر بھالو جی سے کہنے لگے " بھالو جی - یہ تمہارا چیلا تو بڑا اچنبھا ہے - جنگل میں کوئی جگہ بھی ایسی ہے جہاں اس کے جاننے پہچاننے والے نہ ہوں - اچھا - بالکے - ذرا پیچھے ہٹ کھڑا ہو - ہم جالی توڑتے ہیں اور لے زہریلے بھائیو - تم بھی اپنی اپنی بانبیوں میں چلے جاؤ کہ کسی کے چوٹ نہ لگے "

اژدہے نے جالیوں کے گرد چکّر لگایا - اور ایک جگہ پتھر میں زرد سا داغ دیکھ کر اس پر دو چار دفعہ منہ سے ہلکی چوٹ لگائی - اور پھر سر کو صاف دو گز اونچا اٹھا کر پوری طاقت سے پھن کی پانچ چھ موگریاں ماریں + اخیر چوٹ پر جالی پاش پاش ہو گئی - اور اس کے گرتے ہی زلفی گرد و غبار کے بادل میں سے نکل بھالو اور بگھیرے کے بیچ میں آن کودا - اور دونو کی گردنوں میں باہیں ڈال کر ان کی صورت دیکھنے لگا + دونو صحرائی دوست محبت سے اس کا منہ چاٹنے لگے +

بھالو نے زلفی سے پوچھا " بیٹا تمہارے کہیں چوٹ تو نہیں لگی ؟ "

زلفی بولا "جی چوٹ تو ایسی نہیں لگی - مگر بھوک بڑے زور
کی لگی ہے - آپ اپنا حال تو کہئے - روئیں روئیں سے خون ٹپک
رہا ہے ؟"

بگھیرا "ہمارے ہی روئیں روئیں سے لہو نہیں ٹپکتا ہے - بلکہ
ہزاروں جسم خاک پر پڑے ہیں جن سے خون کے فوارے چل چکے
ہیں" اور اتنا کہ بگھیرے نے بندروں کی لاشوں کی طرف نظر دوڑا
اور خون دیکھ کر ہونٹ چاٹنے لگا ۔

بھالو - لہو بہا - بلا سے - زلفی تو جیتا جاگتا مل گیا ۔

بگھیرا - ملنے نہ ملنے کا حال تو آگے چل کر کھلیگا - اب ذرا چھے
کو اتنا تو بتا دیجئے کہ باباجی کو جھک کر سلام کرلے ۔ زلفی - ادھر
دیکھو - وہ کون آتا ہے ؟ یہی پہاڑ کے اژدہے باباجی اجگر ہیں جن
کی بدولت تمہاری جان بچی ہے ۔ زخم تو ہمارے گن لینا - لیکن
بندروں پر فتح پانے کا سہرا ان ہی کے سر بندھا ہے - ذرا سنبھل
جاؤ اور جنگل کے دستور کے موافق باباجی کا شکریہ بجا لاؤ" ۔

زلفی نے مڑ کر نہ دیکھا تھا - کہ باباجی خود اُس کے پاس آگئے
اور زلفی کے قد کے برابر کھڑے ہوکر پھن کا چھتر اُس کے سر پر
پھیلا دیا - اور لال لال دیدے پھرا کر بولے "اچھا یہی وہ آدمی کا
بچہ جنگل کا اچنبھا ہے جس کے لئے اتنی دوڑ دھوپ کرنی پڑی

جلد تو بہت نازک ہے صورت شکل میں بھی بندروں سے ملتا ہے+
اچھا بالکے۔ ذرا ہوشیار رہنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کینچلی بدل کر نکلوں
اور جھٹ پٹے میں بندر سمجھ کر کھا جاؤں "
زلفی نے فوراً شکاریوں کا منتر سُنایا اور کہا" آپ سے کیا
ڈروں گا آپ نے تو میری جان بچائی ہے۔ آج سے میرے شکار
اپنا شکار سمجھئے۔ باباجی آپ مہا اوتار ہیں "
اژدہا۔ سُکھی رہو بیٹا سُکھی رہو۔ ہم تو اب بُڈھے ہو گئے ہیں۔
تم جوان ہو۔ پر ذرا اُس شکار کا تو نام بتاؤ جسے تم مار کر کھاتے ہو+
زلفی " باباجی شکار تو میں نہیں مارتا۔ ابھی بہت چھوٹا ہوں۔
پر ہاں۔ جنگل سے ہرنیاں اور پہاڑ سے بکریاں ہانک ہانک کر آپ
کے پاس پہنچا سکتا ہوں۔ کبھی بھوک کے وقت جنگل میں آئے تو
تماشا دیکھئے۔ یا اگر کبھی پھندے میں پھنس گئے۔ تو میری صفائی
دیکھئے گا۔ کہ کس طرح ایک چٹکی میں بھالو اور بگھیرے کو آپ کے
احسان سے سبکدوش کر دیتا ہوں " یہ کہ کر زلفی نے سب کو جُھک کر
سلام کیا+
زلفی نے ایسی خوبصورتی سے اپنے بڑے بوڑھوں کا شکریہ ادا
کیا۔ کہ اُس کی پیاری باتوں پر سب لوٹ گئے۔ اور بھالو تو ایسا
خوش ہوا۔ کہ بار بار گلا صاف کر کے شاباش شاباش کے نعرے لگانے لگا+

اژدہے نے زلفی کے شانہ پر اپنا پھن رکھ کر زلفی کی تعریف
اور کہا "آفریں ہے اے دل کے مضبوط اور زبان کے شیریں
آفریں ہے تیری دانائی کو۔ بس۔ اب تجھ کو بہت دور جانا ہے۔ جا
اپنے عزیزوں کے ساتھ جنگل میں خوش رہ۔ جا اور سو رہ کہ چا
ڈوبنے کو ہے اور اب جو کچھ یہاں ہونے والا ہے بہتر ہے
اُس کو نہ دیکھے"۔

رقص اژدر

چاند پہاڑوں کے پیچھے چھپنے کو تھا۔ گھاٹوں سے لے
فصیلوں تک ہزاروں بندر منڈیا جھکائے خاموش بیٹھے تھے
اور جہاں تک نظر جاتی تھی۔ شہر پناہ کے کنگوروں پر بندرو
کی صفیں کالی کالی جھالر کی طرح لٹکی چلی گئی تھیں۔ ہر طرف سنا
تھا۔ بھالو اُٹھ کر حوض سے پانی پینے گیا اور بگھیرا زبان سے
اپنی پوستین سنوار رہا تھا۔ کہ اژدہا زلفی کے پاس سے کھس
اور دوڑتا ہوا تال کے کنارے ایک چوڑے سے میدان میں پہن
اور پہنچتے ہی سر اُٹھا کر منہ پھاڑا۔ اور اس زور سے اُس کو بن
کیا کہ جتنے بندر تھے سب اژدہے کی طرف دیکھنے لگے۔ اور اس

اژدہے نے پکار کر کہا " بندرو۔ بندرو۔ دیکھتے ہو کہ چاند ڈوبتا ہے۔ بتاؤ کہ اتنی چاندنی میں تمہیں کچھ سوجھتا ہے یا نہیں ؟"

صدہا بندروں کی آواز نہایت غمگین جیسے ہوا درختوں میں ہچکیاں لیتی ہو درو دیوار سے آئی "اے اژدہے۔ ہاں۔ سوائے تیرے ہمیں کچھ نہیں سوجھتا" ❊

اژدہا۔ اچھّا تو اب دیکھو کہ ہم بھوک سے بیتاب ہو کر خاک پر لوٹتے ہیں۔ اور یہ ہمارا وہ ناچ ہے جو بندر کھانے سے پہلے ہم ناچا کرتے ہیں ❊

اور اب رقص اژدر جو سترہ فاقوں کے بعد اژدہا ناچا کرتا تھا۔ شروع ہؤا۔ ہموار زمین دیکھ کر پہلے بڑے کنڈل میں پھن کو دائیں بائیں لہرا کر دوڑنے لگا۔ پھر زمین پر منہ مارتا ایک کنڈل سے نکل کر دوسرے کنڈل میں پہنچا۔ اور پھر پہلے کنڈل میں آیا۔ اور جب سب چکّر پورے کر لئے۔ تو سیدھا ہو کر دم کے پاس ایک چھوٹا سا حلقہ بنایا۔ اور اس تیزی سے لپٹتا ہؤا گردن تک آیا۔ جیسے کوئی چرخ پر پیتہ چڑھاتا ہو ❊

پھر کچھ دور تک کھُل کر عجیب عجیب صورت کے پیچ و خم کھا کر ایک شکل سے دوسری شکل میں ڈھلنے لگا۔ جسم کے کسی حصّہ کو سکون نہ تھا۔ اور کوئی نقش نہ تھا۔ کہ بنتے ہی بدل نہ جاتا ہو۔ کبھی بدن کو

لڑیوں کی طرح بن کر چٹیا سی گوندھ لینا۔ کبھی طرح طرح کے خوبصورت لہرئے زنجیرے بناکر خاک پر کشیدہ کاڑھنا۔ کبھی اُلجھ کر بالکل گورکھ دھندا معلوم ہونے لگتا۔ اور کبھی سلجھ کر اینٹوں کے اونچے اونچے ٹھئے زمین پر لگا دیتا۔ اور کنڈلیوں کے مورچوں پر پھن کا چتر کھول کر لال لال آنکھوں سے بندروں کی طرف دیکھنے لگتا ﴿

لوٹنے اور گھسٹنے کی آواز کے ساتھ پھنکاروں کا لہرا کہیں نہ تھمتا تھا۔ اور تنفس کا یہ عالم تھا۔ جیسے دیگ میں پانی جوش کھاتا ہو۔ یہاں تک کہ چاندنی مٹنے لگی اور خاک پر لوٹنے کے نشان بھی دُھندلے ہوگئے اور تھوڑی دیر میں اندھیرا ہوکر فقط زمین پر کسی چیز کے رگڑنے اور گھسٹنے کی آواز باقی رہ گئی ﴿

بھالو اور بگھیرا یہ تماشا دیکھتے دیکھتے بالکل پتھر کی مورتیں بن گئے گردن کے بال سیخوں کی طرح کھڑے ہوگئے حلق ہی حلق میں غرّاتے تھے۔ مگر ہاتھ پاؤں میں حرکت کی قوت باقی نہ رہی تھی + زلفی حیران تھا کہ ان دونوں کی یہ کیا حالت ہوتی جاتی ہے ﴿

اور اب اژدہا کنڈلی کے بیچ سے پھن اُٹھاکر بولا "بندرو بتاؤ کہ تم بغیر ہمارے حکم کے ہاتھ یا پاؤں ہلا سکتے ہو؟"

شہر پناہ کے کنگوروں سے ایک نحیف آواز آئی "نہیں اے اژدہے۔ ہم بغیر تیرے حکم کے ہاتھ ہلا سکتے ہیں نہ پاؤں" ﴿

اژدہا۔ اچھا تو ہمارا حکم ہے کہ تمہاری جس قدر صفیں ہیں ایک ایک قدم آگے چلی آئیں ؛

اس حکم کے ساتھ بندروں کی تمام صفیں اس سرے سے دوسرے سرے تک بالکل بے اختیار ایک ایک قدم آگے بڑھ آئیں ؛ بھالو اور بگھیرا بھی بلا قصد ایک ایک قدم آگے بڑھ گئے ؛

اژدہے نے منہ پھاڑ کر کہا۔" اچھا اَور قریب آؤ"! سب کے سب اَور قریب چلے آئے ؛ بگھیرے کے ساتھ بھالو بھی آگے بڑھنے کو ہؤا۔ زلفی نے دونو کو زور سے روکا اور اُس کے روکتے ہی دونو ایسے چونک پڑے جیسے کوئی نیند سے چونکتا ہو ؛

بگھیرے نے زلفی کے کان میں کہا کہ" زلفی پیارے میرا شانہ خوب مضبوط پکڑے رہنا۔ اگر چھوڑ دیا۔ تو یونہیں جیتا جاگتا اژدہے کے حلق میں جا رہونگا ؛ ارے رے رے! زلفی روک روک۔ دیکھ میں چلا۔ اژدہے کا منہ کھلا ہے"؛

زلفی گھبرا کر بولا" بھائی بگھیرے۔ بھائی بگھیرے۔ خیر تو ہے؟ تمہیں کیا ہو گیا۔ ایسی پتھرائی آنکھوں سے اژدہے کی طرف کیوں دیکھے جاتے ہو؟ کچھ نہیں ہے۔ زمین پر سانپ لوٹ رہا ہے۔ تمہارا جی کیسا ہے؟ منہ سے کیوں نہیں بولتے؟ اچھا۔ اچھا۔ گھبراؤ نہیں۔ ادھر سے پیٹھ پھیر کر نکل چلو"۔ اور یہ کہتے ہی پیٹھ

پھیر زلفی دونو دوستوں کو شہر پناہ کے ایک سوراخ سے نکال
سیدھا جنگل کو ہولیا ۔

اٹل قانون

شہر سے نکلتے ہی سب کے دم میں دم آیا اور گرو بولے "افوہ!
آج سے جیسی جی چاہے۔ قسم لے لو۔ جو کبھی اژدہے کے پاس جاؤں"
اور یہ کہ کر بھالو سر سے پیر تک تھر تھر کانپنے لگا ۔
بگھیرے نے کہا "بے شک اژدہے کے سامنے ہماری کچھ
حقیقت نہیں۔ اگر تھوڑی دیر اور ٹھہرتے۔ تو تمہاری تو کہنا نہیں۔
میں تو اژدہے کے حلق میں کبھی کا پہنچ گیا ہوتا" ۔
بھالو بولا "معلوم نہیں شام تک کتنے اسی رستہ اژدہے کے
پیٹ میں پہنچ جائیں گے۔ آج اُس کو شکار کی کیا کمی ہے۔ اور پھر
بندر جیسا من بھاتا چارہ کہاں ملے" ۔
زلفی ان باتوں کا مطلب خاک نہ سمجھا۔ اُس کو کچھ خبر نہ تھی۔ کہ
اژدہے کی نظر جانوروں پر کس بلا کا اثر رکھتی ہے + بار بار پوچھتا
تھا کہ آپ اس قدر کیوں پریشان ہو گئے تھے ؟ وہ بات ہی کیا
تھی۔ ایک لمبا سا سانپ زمین پر لوٹ رہا تھا اور اُس کی ناک زخمی

ہو رہی تھی "

بگھیرا بگڑ کر بولا " ناک زخمی ہو رہی تھی۔ مگر کس کی وجہ سے؟
یہ تمہارے کرتوت ہیں۔ کہ اپنوں اور بیگانوں سب کو زخمی کر دیا۔
اژدہے کی ناک ٹوٹی۔ میری اور بھالو کی پوستین قابل رفو نہ رہی۔
اور تمہارا تو ظاہر ہے۔ ایک کھیل تھا + اب کس میں دم رہا ہے
کہ خوش ہو کر جنگل میں شکار کھیلے؟ اس صدمے سے سنبھلنے کو
بھی مہینوں چاہئیں "

بھالو بولا " جانے بھی دو۔ جیتے ہیں۔ تو شکار بھی ہو رہے گا۔
زلفی تو زندہ سلامت مل گیا اور کیا چاہتے تھے "؟

بگھیرا۔ اِس میں کس کو کلام ہے۔ لیکن وقت کا بھی تو خیال
کیجئے کہ کس قدر ضایع ہوا ہے۔ اگر یہی وقت شکار میں صرف
ہوتا تو کیا خوب ہوتا + میرا درجہ نہ سہی۔ اپنا درجہ تو دیکھئے۔ اب
کون جیتا بیٹھا ہے کہ اس اُدھڑے کمبل کو بیٹھ کر گانٹھے گا؟ پشت
سے کمر تک بیسیوں جگہ جیتا چمڑا نکل آیا ہے۔ اچھّا۔ اور پھر یہ
نقصان بھی سب سہے۔ عزّت جو کچھ خاک میں ملی وہ کہاں سے پیدا
ہو گی؟ زلفی آج تو نے ہمارا وہ درجہ کیا ہے۔ کہ ہم میں بیان کی
طاقت نہیں! میں نسل پلنگ کا نام لیوا۔ اور بندروں سے لڑنے
میں ایسا گھبرا جاؤں۔ کہ اژدہے کا نام لوں اور سانپوں سے پناہ

انگوں؟ اور اژدہے کا ناچ دیکھ کر ایسا مدہوش اور بدحواس ہو جاؤں کہ تن بدن کی کچھ خبر نہ رہے؟ یہ وہ باتیں ہیں۔ جو آج سے پہلے نہ کبھی سُنی تھیں نہ دیکھی تھیں + افسوس! یہ جتنی رسوائی ہوئی ہے۔ تیری وجہ سے ہوئی ہے۔ نہ تو بندروں سے آشنائی کرتا۔ نہ ہم اس حال کو پہنچتے"

زلفی نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا +

بھالو کڑک کر بولے "بتاؤ جنگل کی پوتھی اس قصور کی سزا میں کیا کہتی ہے؟"

بھالو کا جی تو نہیں چاہتا تھا۔ کہ زلفی کو سخت سزا دی جائے۔ لیکن قانون کی پابندی ہر صورت میں لازم تھی + زلفی اپنی حرکتوں پر پشیمان تھا۔ لیکن پشیمانی سے سزا تو ٹل نہیں سکتی۔ بھالو نے بگھیرے سے کہا دیکھو۔ سزا کے وقت اس کا لحاظ رہے کہ لڑکا کمزور اور نادان ہے"

بگھیرا بے شک سزا کے وقت اس کا لحاظ کیا جائے گا۔ لیکن اس کے قصور میں کچھ شبہ نہیں + زلفی تمہارا جرم ثابت ہے۔ اگر تم کو کچھ کہنا ہے تو کہو کہ کیوں تم کو سزا نہ دی جائے؟

زلفی نے جواب دیا "مجھ کو کچھ نہیں کہنا۔ آپ جو سزا دیں گے۔ وہ مناسب ہوگی اور انصاف کا خون نہ ہوگا"

یہ سُن کر بگھیرے نے ایک پنجہ اُٹھایا۔ اور ناخن چھپا کر اُ
ہاتھ سے تین چار پیار کے طمانچے لگائے۔ بگھیرے کے نزدیک
یہ بہت پیار کی سزا تھی۔ لیکن سات برس کے بچّہ کے حق میں
یہ سزا ایسی سخت تھی۔ کہ جیسے کسی مکتب کے لڑکے کو بڑے
زور کی مار پیٹ ہو۔

جب مار پیٹ چکی۔ تو زلفی دو چار چھینکیں لے زمین سے اُٹھا
اور بگھیرے نے اُس کو پیار کر کے کہا "آؤ زلفی آؤ میری پیٹھ
لیٹ رہو۔ اور اب ہم سب گھر چلتے ہیں"۔

جنگل کے قانون میں یہ بڑی خوبی تھی۔ کہ جہاں کسی قصور
سزا مل گئی۔ پھر کسی کے دل میں کچھ غبار نہ رہتا تھا۔

زلفی بگھیرے کی پیٹھ پر لیٹ کر ایسا سویا۔ کہ جب تک غار
کے بھٹ میں بگھیرے نے اُس کو اپنی پیٹھ سے نہ اُتارا۔
بے خبر سوتا رہا۔